آنکھ مچولی

شکیلہ اختر

آنکھ مچولی

عورتوں کی رومانی اور سماجی زندگی

کے

دلچسپ اور سبق آموز افسانے

از: ۔۔۔۔۔۔

شکیلہ اختر

جملہ حقوق محفوظ ہیں

طبع اوّل مئی سنہ ۱۹۴۸ء

قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ

شعبۂ اُردُو

نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلکیشنز لمیٹڈ

نیشنل ہاؤس ۶ اپالو بندر بمبئی ۱

قادری پریس نور منزل محمد علی روڈ بمبئی ۳

میں طبع ہوا

افسانے

اعتراف ۵

بزُدل ۳۴

مدّ وجزر ۴۸

انتخاب ۶۹

تم کس نگری میں بستے ہو ۸۵

آنکھ مچولی ۱۰۳

پکار ۱۲۱

بیچاری ۱۳۳

صدائے واپسیں ۱۵۱

سوکھا ہوا پودا ۱۵۹

کیڑے ۱۷۱

اعتراف

بہت سویرے ہی اُس کی نیند ٹوٹ گئی اور وہ ایک خمار آگیں انگڑائی لیتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ ساری رات اسی صبح ہونے کے اِنتظار میں وہ کتنی بے چین رہی تھی۔ اور اب آسمان کے دھندلکے میں صبح کی ضیاء پھیلتی جارہی تھی۔ وہ اپنے بستر پر لیٹی لیٹی تکیہ پر جھک گئی کمرے کے اندر اور سارے مکان پر جیسے نیند کا نشہ طاری تھا۔ ایسی خاموشی اس کو اچھی نہ لگی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اسی کی طرح گھر کی ساری چیزیں بھی جاگتی رہیں، مسکراتی رہیں اور مسرّتوں کے نغمے گنگنائیں ۔۔ مگر ابھی تو وہ خود ہی خاموش تھی، تو پھر وہ کون سا گیت گاتی؟ اس کو کتنے کم گانے یاد تھے۔ اس کے لبوں کو ایک ہلکی سی جنبش ہوئی۔۔

"تم نے دیکھا تھا محبت کی نظر سے مجھ کو
پھر مرے دل پہ جو گذری مجھے کچھ یاد نہیں"

وہ آپ ہی آپ مسکرا دی، اور اس کو ایسا لگا جیسے اس کے تبسم اور اور انتظار، کمرے میں کہر بن کر ہر طرف چھا گئے ہیں۔ اکیلے کمرے کے اندر اتنی خاموشی میں اس کا جی نہ لگا، وہ لیٹی ہی لیٹی اپنے سرہانے دریچے کے پاس سرک آئی۔ باہر احاطے کے درختوں پر ہواؤں کی سرسراتی ہوئی لہریں ناچ رہی تھیں۔ اُس نے آسمان پر جھلملاتے ہوئے ستاروں کو دیکھا اور اس کا دل بے اختیار چاہنے لگا کہ اتنے چھٹکے ہوئے یاسمین کے پھولوں کا وہ ایک ہار بنا لے "پاگل" تنہا کمرے میں وہ ایک بار مسکرا دی — وہ پاگل ہی تو تھی جو ان بجھتے ہوئے ستاروں کا ایک ہار بنانا چاہ رہی تھی۔

یہی کمرہ یہی تنہائی اور یہی سنّاٹا سا مکان اس کو کتنا پسند تھا۔ جب اُس کے گھر کے سارے لوگ گرمی سے پریشان ہو کر دارجلنگ جانے لگے تو وہ بڑی مشکلوں سے اسی مکان کی تنہائی کو اپنانے کی اجازت لے سکی تھی۔ سارے ہنگاموں سے دُور اس نے اپنے بھٹکے ہوئے خیالات کو یکجا کرنا چاہا تھا۔ مسلسل دو سالوں سے اس کی روح تھکی تھکی سی جا رہی تھی۔ گذری ہوئی چند یادگار گھڑیوں کو وہ کسی صورت سے بھی نہ بھلا سکی تھی۔ اور اب وہ اپنے کو بھول کر بہت سی بیتی ہوئی یادوں کو بھول جانا چاہتی تھی۔ مگر اب جبکہ اس کا دل تنہائیوں میں گھبرا گھبرا کر اس کا عادی ہوا جا رہا تھا تو یک بیک۔ جاوید نے شاہینہ کو خط لکھا تھا کہ وہ اس سے ملنے کے لئے

آ رہا ہے۔ وہ خط اُس کے بھائی جان کے یہاں سے پتہ کاٹ کر بھیجا گیا تھا۔ اور اس نے تار دے کر جاوید کو اپنے موجودہ پتے سے مطلع کیا۔ رہ رہ کر اس کو حیرت ہو رہی تھی کہ وہ ابھی تک جاوید کو یاد تھی۔ گذری ہوئی پُر مسرت ساعتیں اس کی نگاہوں میں تڑپنے لگیں۔ اور یکبارگی ساری بچھڑی ہوئی تمنّاؤں کی شمعیں اسکی روح میں جگمگا اُٹھیں۔

بھولی ہوئی بہت سی یادیں، اور بسری ہوئی عزیز گھڑیاں اس کی نگاہوں سے لپٹتی جا رہی تھیں، اور وہ خود بخود کھلی جا رہی تھی۔ اس نے اپنی الماری کے زنگ لگے ہوئے تالے کو بڑی مشکلوں سے کئی چابیوں سے پریشان ہو ہو کر کھولا۔ گردے اور دُھول سے الماری اور اس کی ساری چیزیں اَٹی پڑی تھیں۔ مختلف رنگوں کے ڈبے، کئی طرح کے برش، چوکھٹے، کاغذ، پنسلیں اور تصویر کشی کے سارے سامانوں کو اُس نے خود ہی سے جھاڑ جھاڑ کر نکالا۔ اس کو اپنی ان عزیز چیزوں کی کس مپرسی پر بڑا افسوس لگ رہا تھا۔ ایک ایک برش کو بہت بہت دیر تک وہ اپنے ہاتھ میں لئے ماضی کے نقوش ڈھونڈتی رہی۔ جاوید کی لمبی لمبی انگلیوں کے درمیان کتنی کتنی دیر تک یہ کانپتی رہ چکی تھیں۔ "میرا مصور" ـــ ایک شگفتہ سا تبسّم اس کے لبوں پر آیا۔ "تو تو خود ہی فطرت کا ایک بہترین شہہ کار ہے" ـــــ اُسی الماری میں سے شاہنہ نے ایک چھوٹی سی اٹیچی نکالی، اُس نے اندر

کئی طرح کے فریموں میں جاوید کی مختلف تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے ان تصویروں کو بڑی محبت سے اپنے آنچل سے صاف کیا۔ اور اپنے کمرے میں آتشدان کے اوپر، میز، چھوٹے ٹیبل اور اپنے بستره کے قریب ریک پر رکھکر انہیں کبھی نزدیک اور کبھی دور سے دیکھنے لگی۔ وہ جہاں جہاں جا رہی تھی، جدھر جدھر چل رہی تھی اور جیسے جیسے چھُپ رہی تھی جاوید کی نگاہیں اسے تکتی جا رہی تھیں ۔۔ گھنی پلکوں کے سایہ میں وہی نشتر برساتی ہوئی نغمہ بارسی آنکھیں۔ اس کے لبوں پر اب بھی وہی دلاویز تبسم چھا رہا تھا۔ اور یہی آنکھیں یہی لب شاہنہ کو کتنے عزیز تھے، اُسکے دل و دماغ میں گذرے ہوئے خیالات کسی آندھی کی طرح چھاتے چلے جا رہے تھے ۔۔! کتنے اچانک طور پر جاوید اس کی زندگی میں آیا تھا۔ وہ ایکدن شام کے دھندلکے میں بالکل اکیلی سمندر کے پانی میں اپنا پاؤں ڈالے خاموش بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ یک بیک اپنے بہت ہی نزدیک کی آواز سُن کر وہ چونکی۔ "محترمہ! براہِ نوازش، ذرا آپ اپنے چہرے کا تھوڑا سا حصّہ اس روشنی کی طرف پھیر لیں"۔ وہ شاہنہ کے ٹھیک سامنے چوکھٹے میں جڑے ہوئے کاغذ پر پنسل سے چند لکیریں کھینچتا ہوا بولا ۔۔ شاہینہ غصہ سے تلملا گئی ۔۔ "سُنئے میں۔ میں ۔۔ میں آپ کی اس بیہودگی کو قطعی پسند نہیں کرتی۔ شائد آپ اچھے اور بُرے لوگوں کی پہچان بالکل نہیں رکھتے"۔۔ اُس کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو رہا تھا۔ اور وہ سارے

بدن سے کانپ رہی تھی۔ " معاف کیجئے گا محترمہ۔ مجھکو اس کا افسوس ہے کہ آپ نے ایک بہترین ماڈل کو شہہ کار بننے نہ دیا۔ مجھکو ایسی ہی آنکھوں کی تلاش تھی مستغرق اور کھوئی ہوئی سی آنکھیں "۔ شاہنہ نے نفرت سے تپتے ہوئے اس کو دیکھا۔ سچ مچ اس کی آنکھیں اُداس ہو رہی تھیں۔ جیسے کالی گھٹاؤں میں ڈوبتا ہوا چاند ـــ وہ غصہ سے تنتناتی ہوئی وہاں سے اُٹھ کر جانے لگی تھی کہ وہ اس کے قریب آ کر بڑے انکسار سے سر جھکا کر سنجیدگی سے بولا " میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں محترمہ۔ مجھکو نمائش میں بھیجنے کے لئے ایک بہت ہی اہم ماڈل کی تلاش تھی "۔ شاہنہ کچھ نہ بول سکی۔ وہ ایسے بیہودے انسان کو منہ لگانا بھی نہ چاہتی تھی۔ جب وہ کافی دور جا چکی تو اُس نے ایک بار مڑ کر پیچھے دیکھا۔ سُرمئی شام کے دھندلکے میں اس کی سفید قمیص اور سفید ہی پینٹ ابھی تک نظر آ رہے تھے۔ اس کو خود بخود ہنسی آ گئی۔ کیسا عجیب تھا وہ بھی۔ بڑی بے تکلفی سے فرمایا جا رہا تھا کہ ذرا ادھر رُخ پھیر لیں ـ بد تمیز "۔ جیسے میں نہ جانے اس کی کیا ٹھہری۔ مگر رہ رہ کر شاہنہ کو اس کی شوخی اور شرارت یاد آ رہی تھی۔ وہ کتنی زبردستی سے اپنے چہرے پر سنجیدگی لا سکا تھا ـــ وہ سیدھی گھر چلی آئی۔ اس کو سمندر کے کنارے تنہا چلے جانے کا افسوس ہو رہا تھا۔ اس نئے شہر میں اس کو پہچاننے والا بھی کون تھا۔ اور یہی سوچ کر اُس نے یہ پہلی جرأت کی تھی ـــ

وہ ملنے ملانے سے بہت بھاگتی تھی، مگر جب کبھی اس کے بھائی جان اپنے دوستوں کو بھابی جان سے ملانے کو گھر کے اندر بلا لیتے تو اس لپیٹ میں بچاری شاہنہ بھی پکڑلی جاتی تھی۔ اور اپنی بھابی جان کی وجہ سے وہ یہاں قید بھی کی گئی تھی کہ نئی نئی بھابی جان بھلا اتنا دور کیسے تنہا رہ سکتی تھیں۔ اور اس کے بھائی جان کے دوستوں کی تو جیسے کوئی تھاہ ہی نہ ملتی تھی، برساتی میں وقت اور بے وقت سائیکلوں کی قطاریں لگ جاتیں، نئی پرانی اور چمکتی ہوئی مختلف کمپنیوں کی سائیکلیں، جیسے ایک بازار سا لگا ہوا ہو۔ کمرے کے اندر برج کی زبردست بازی جم جاتی اور سگریٹ کی بو، ہر طرف گمک اُٹھتی تھی۔ اور اس کے بعد چائے کے بھرے بھرے طشتوں کا تانتا بہت دیر تک جاری رہتا۔ جانے ان کے ہاتھ بھی تھکتے تھے۔ اتوار کا سارا دن بس اسی طرح کھیلتے کھیلتے گذر جاتا اور ان کو پتہ بھی نہ چلتا کہ وقت کیسے گذر جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ جنون انہیں ساری ساری راتوں کو بھی جگا دیتی تھی اور جب وہ سب چلے جاتے تو کمرے کی عجیب حالت رہتی۔ قسم قسم کے سگریٹوں کے خالی ڈبے، جلی ہوئی سلائیوں کی لاتعداد کانٹیاں۔ اور سگریٹوں کے اَن گنت چھوٹے چھوٹے جلے ہوئے ٹکڑے، سارے کمرے میں ہر طرف بکھرے پڑے رہتے تھے۔ اور شاہنہ کو یہ سب باتیں بہت ہی ناپسند تھیں۔ لیکن پھر بھی اس کے دل میں بھائی جان اور ان کے دوستوں کی

بڑی عزت اور قدر تھی، جب وہ ہڑبونگ مچانے کی جگہ علمی اور ادبی باتیں کرتے یا ہندوستان کی سیاسی گتھیوں کو سلجھاتے رہتے تو اکثر شاہنہ یہی سوچتی رہتی کہ جو سگریٹ کے دُھوئیں میں صرف بازی پر بازی لگانا جانتے ہیں، وہ یہی لوگ ہیں!"

صبا کے سارے دوستوں میں احسان اس کا سب سے زیادہ عزیز دوست تھا، وہ کالج کا ایک نوگرفتار لیکچرار تھا جس سے لڑکے ذرا بھی نہ ڈرتے تھے اور وہ اکتوبر کی لمبی چھٹیاں گذارنے صبا کے پاس آگیا تھا۔ بھابی جان اور مس لاولی احسان سے بہت متاثر تھیں مگر شاہنہ کو اس میں کوئی نمایاں خوبی نظر نہ آتی تھی۔ لیکن مس شاہنواز کا خیال تھا کہ احسان غیر معمولی طور پر شاہنہ کی طرف جُھکتا جا رہا ہے۔ اور شاہینہ کو یہ سُن کر افسوس آنے لگتا۔ "بچاری شاہنواز"۔ کتنی حسرت سے اس کی نگاہیں احسان کی طرف اُٹھتی تھیں۔ وہ ہر کھیل میں احسان کی پارٹنر بننے کے لئے لڑائی کیا کرتی! اور آنرس کی تیاری میں احسان ہی اس کی مدد کر رہا تھا۔ شاہنہ نے کئی بار چاہا کہ مس لاولی یا شاہنواز سے وہ دریافت کرے کہ یہاں وہ کسی مصور کو بھی جانتی ہیں؟ وہ تو یہیں کی رہنے والی تھیں اور شاہنہ تو یہاں کے لئے بالکل ہی اجنبی تھی، مگر اس کو پوچھنے کی جرأت نہ ہوتی کہ "وہ کون تھا" اور اس کے دل کی خلش بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس کو رہ رہ کر یہی خیال آتا کہ وہ کتنا بڑا ڈھیٹ تھا۔ اس نے کئی دفعہ چاہا بھی کہ ایک بار پھر

سمندر کے کنارے جائے اور شاید وہ اسے کہیں پھر سے دیکھ لے۔ کئی دنوں کے بعد وہ اپنی بھابی اور دوستوں کے ساتھ تصویر لینے کے بہانے سے اسی جگہ گئی، وہاں بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ مگر وہ کہیں پر نظر نہیں آیا۔ کئی کئی پوز سے بہت سے فوٹو لئے گئے۔ تفریح ہوتی رہی مگر شاہنہ کی نگاہوں میں وہ گذری ہوئی پہلی شام رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ کتنا بڑا شریر اور کتنے عجیب طرح کا شوخ تھا وہ، اور یہ بھی اس کے خیال کی زبردستی ہی تھی نا، جو اس کو نہیں سوچنے کے عزم کے باوجود وہ خواہ مخواہ اسے یاد آئے جا رہا تھا۔ ایسے ہی کبھی کبھی شاہنہ کے دل میں ایک ہلکی سی چبھن اٹھتی اور شام کے دھندلکے میں اس کو دو اداس آنکھوں کی افسردگی یاد آ جاتی۔ شاہنہ کو مصوری سے ہمیشہ دلی وابستگی رہی تھی مگر اس کا شوق ابھی تک تشنۂ تکمیل ہی تھا۔ اور اسی لئے رہ رہ کر چوکٹے میں جڑے ہوئے کاغذ کی چند کھنچی ہوئی لکیریں یاد آ کر اس کے دل میں ایک کسک پیدا کر دیتی تھی۔

بھائی جان کے دوستوں کی پارٹی ایک ساتھ مل کر نمائش میں جانے کا ارادہ طے کر کے نمائش کھلنے کا بیتابی سے انتظار کر رہی تھی ایک کار تو صبا کی اپنی تھی دوسری کے لئے مس شاہنواز کو پہلے ہی سے کہہ دیا گیا تھا۔ یہ لوگ شہر سے کافی دور تھے اسی لئے نمائش ان کے لئے بہترین پک نِک کی صورت بن گئی تھی۔ بھابی جان اور مس شاہنواز کو بہت سی چیزیں خریدنی تھیں اور شاہنہ کو نمائش کا اس لئے انتظار

تھا کہ وہ پہاڑ جنگل اور جھیلوں کی تفریح سے عاجز آ گئی تھی۔ بچارے صبا کو تو ہر روز ہی دفتر آتے جاتے اتنی دور کا چکر لگانا پڑتا تھا۔ دونوں کاریں ایک ساتھ چلیں۔ بھابی اور شاہنواز کا پرس کافی دبیز ہو رہا تھا اور شاہنہ ان دونوں سے حصہ بٹانے پر تلی ہوئی تھی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد صبا اپنے کسی دوست کے یہاں اُترنے لگا، آج کئی مہینے پر اس کی کوٹھی کھلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ساری پارٹی صبا کے خلاف ہو گئی۔ آخر میں یہی طے پایا کہ وہ سارے لوگ واپسی میں اسی گھر میں آ کے چائے پئیں گے۔ راستہ بھر صبا اور اس کے دوست اسی خبطی دوست کا تذکرہ کرتے رہے۔ ٹکٹ کی دعوت بھی بھابی جان کیطرف سے تھی اور مس لاولی چائے پلانے والی تھیں، مس شاہنواز کی طرف سے دال موٹ کے پیکٹ بٹنے والے تھے۔ اور شاہنہ صرف تماشہ دیکھنے والی تھی ـــ اکزبیشن بہت بڑے پیمانے پر لگا تھا۔ بھابی جان نے کئی بنارسی ساڑیاں خریدیں۔ لاولی نے ڈرائنگ روم کی آرائش کے لئے بہت سی چیزیں لیں اور مس شاہنواز نے ساری دوکانوں سے کچھ نہ کچھ خرید کر چیزوں کا ایک ڈھیر جمع کر لیا تھا مگر شاہنہ نے سوائے رواں دار بندر کے اور کچھ نہ خریدا، اور اس بچارے بندر کو بھی کوئی اپنے ہاتھ میں لینے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ آخر میں بچارے احسان ہی کو اسے سنبھالنا پڑا۔ اب وہ سب کے سب تصویروں کی نمائش گاہ کی طرف چلے۔ جس کا ایک بہت بڑا

حصہ علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ دنیا بھر کی ساری حسین تصویریں جیسے ایک ہی جگہ اکٹھی کر دی گئی تھیں۔ نمائش بھر میں صرف وہی تصویریں فسٹ اور سکنڈ ہو سکی تھیں۔ بقیہ پر کوئی نمبر نہ لگا تھا، سارے لوگ اول آنے والی تصویر پر ٹوٹ پڑے۔ وہ صرف ایک منظر کی تصویر تھی اس کی منظر کشی اور مصور کے ہاتھ کی صفائی اعلےٰ درجہ کی تھی۔ اس کے بعد سکنڈ آنے والی تصویر پر سب کے سب جھک پڑے۔ جیسے ہی اس تصویر کی ایک جھلک شاہنہ نے دیکھی اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ وہی سمندر کے کنارے بیٹھی ہوئی اسی کی تصویر کو سارے لوگ اشتیاق سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے زور کا چکّر دے کر کسی نے اس کو آسمان کی بلندی پر سے اچانک نیچے دھکیل دیا ہو — اس کے دل کی تیز دھڑکن اس کے دماغ میں گونج رہی تھی اور اس کا چہرہ غصہ اور شرم سے گلنار ہو گیا۔ وہ جلدی سے اپنی پریشانیوں کو چھپانے کے لئے رومال سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھنے لگی۔ وہ تو غنیمت تھا کہ تصویر میں چہرے کا صرف ایک ہی رُخ تھا۔ "کمینہ!" "بدتمیز" — وہ غصہ سے تلملائی جا رہی تھی۔ اتنی ساری تصویروں میں دُور ہی سے شاہنہ کی صورت جھلک رہی تھی۔ اسی کا چہرہ تھا اسی کے رُخسار تھے، اسی کے لب اور اسی کی مستغرق کھوئی ہوئی سی آنکھیں تھیں۔ خوبصورت منظر اور خود فراموشی کے عالم کی یہ تصویر، انتہائی طور پر کامیاب تھی۔ مگر تصویر میں مصور کا نام کہیں پر بھی درج نہ تھا۔ شاہنہ وہاں سے

بھاگ جانا چاہ رہی تھی۔ اس کا جی ڈر رہا تھا کہ کوئی اس کی پریشانی کو دیکھ نہ لے۔ اس کے دل و دماغ میں خیالات کے بگولے سے اٹھ رہے تھے مگر وہ اتنے جلدی اس کی تصویر کس طرح سے لے سکا تھا؟ شائد اس کی بے خبری میں پہلے ہی سے اس نے کیمرہ سے فوٹو لے لیا ہو اور اس کے بعد صرف اسے چھیڑنے کو مخاطب کیا ہو۔ کیمرہ کی تصویر سے بھی تو مصوری کی جا سکتی تھی۔ احسان کی نگاہیں تصویر سے ہٹ کر شاہینہ پر جم گئیں۔ اور بھابی جان مسکراتی ہوئی بولیں "شاہینہ دیکھتی ہو تمہیں کوئی چرا لے گیا ہے۔" وہ شرماتی ہوئی ایک کھوئی سی ہنسی ہنس دی۔ میں اتنی اچھی سی کب ہوں بھابی جان"۔ اس کا نمائش سے جی گھبرا گیا۔ اس نے کئی بار مس شاہنواز اور لاولی کو چلنے کے لئے کہا بھی مگر ان کو اتنی جلدی نہ تھی۔ جب سارے لوگ جی بھر کے نمائش کا کئی بار چکر لگا چکے تب انہیں واپسی کی یاد آئی۔ شاہینہ کا جی کچھ ہلکا ہلکا محسوس ہونے لگا کہ کوئی بھی ایسی تصویر کو یقینی طور پر نہ پہچان سکا تھا۔ اس کا دل بجھا بجھا سا لگ رہا تھا اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس بدتمیز کو خوب خوب سلواتیں سنائے۔ مگر وہ کون تھا؟ شام کے دھندلکے میں ایک شیطانی روح سے زیادہ وہ اسے کچھ نہ سمجھ سکی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر صرف شاہینہ کو ستانے کے لئے وہ تصویر بغیر نام کے بھیجی تھی۔ راستہ بھر وہ یہی سوچتی آ رہی تھی کہ یک بیک ٹھہرتے ہوئے موٹر کے جھٹکے سے وہ بھابی جان کے اوپر گر پڑی۔ "ارے تم سو رہی تھیں

شہنو!"۔ سارے لوگ موٹر سے اُتر پڑے شاہینہ اُترنا نہ چاہتی تھی مگر لاولی اُسے گھسیٹ کر لے گئی، وہ سب سے آخیر میں ڈرائنگ روم میں پہونچی۔ بھائی جان' بھابی جان کا تعارف کرا رہے تھے۔ "یہ ہماری ہوم گورنمنٹ ہیں۔ یہ مس لاولی چیٹرجی' اور یہ ہماری بہن مس شاہینہ بھائی جان اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہے تھے کہ شاہینہ نے ایک اچٹتی ہوئی نظر اس پر ڈالی اور اسکو ایسا لگا جیسے وہ سچ مچ یہیں پر مر جائے گی۔ وہی اداس آنکھیں اسے حیران نظروں سے تک رہی تھیں صبا اور اس کے سارے دوست اس کی جان سے چپٹے جا رہے تھے۔

"تم نے آنے کی خبر کیوں نہ دی؟ کب آئے؟ اور اتنے خاموش کیوں رہے؟" اور شاہینہ یہ سوچ رہی تھی کہ یہ شیطان گیا ہی کب تھا یہاں سے"۔ وہ بڑے خلیق طور پر ان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اتنے عرصے میں صرف دو دنوں کے لئے ہی آسکا تھا اور اب وہ صرف نمائش کی تصویروں کو دیکھنے چلا آیا ہے۔"

شاہینہ کے دل میں جیسے کوئی بچھو زور سے ڈنک مار گیا ہو" اکزبیشن کی تصویریں" اور اس کو ایسا لگا جیسے اس کا راز سارے لوگوں پر ظاہر ہو چکا ہے۔ وہ سب سے کنارے ایک صوفے پر بیزار بیزار سی بیٹھی تھی۔ بھابی جان، شاہنواز اور مس لاولی سے باتیں کئے جا رہی تھیں اور بھائی جان کے سارے دوست ایک طوفان مچائے ہوئے تھے۔ نمائش کی تصویروں پر بہت دیر تک بحث ہوتی رہی۔

اور اسی شریر کو اصرار کر کے اپنے کو پاگل یا خبطی سمجھے جانے پر مجبور کیا جا رہا تھا جس نے مثالی تصویر بنا کر بھی نمائش میں کوئی حصہ نہ لیا تھا۔ اور شاہینہ کو دور ہی سے یہ دیکھکر غصہ آ رہا تھا کہ وہ کسقدر کامیاب طور پر بنتا جا رہا ہے۔

اس نے اپنے ہاتھوں سے سب کو چائے کی پیالی پیش کی۔ جب وہ شاہینہ کے قریب آیا تو اُس نے بڑی سرد مہری سے کہا "معاف کیجیئے گا میں نہیں پیتی۔" وہ کچھ دیر تک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ شاہینہ کو دیکھتا رہا! ور پھر وہاں پر سے چلا آیا۔ ڈرائنگ روم میں اس کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی بہترین تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں اور شاہینہ خاموشی سے بیٹھی حیرت سے یہ دیکھ رہی تھی کہ ڈرائنگ روم کے سارے گلدانوں اور ساری تصویروں میں صرف سفید ہی سفید رنگ کے پھول تھے۔ قریب ہی دوسرا کمرہ خاص طور پر نگارخانہ بنایا گیا تھا۔ شاہینہ دُور ہی سے مصوری کی ایک ایک چیز کو بڑے ذوق اور انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اچانک اس کے پاس آیا۔ "مس شاہینہ کیا آپ کو بھی مصوری پسند ہے؟" اس کی ان مسکراتی ہوئی آنکھوں میں ایک ایسا خمار بھرا ہوا تھا کہ شاہینہ کی کی بیزار نگاہیں بھی اُسے تکتی ہوئی رہ گئیں۔ وہ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے وہ تبسم ریز لب اور وہ ہنستی ہوئی آنکھیں، مگر وہ کتنا شریر، اور بڑا ڈھیٹ تھا۔ شاہینہ نے اپنی نگاہوں کو اس طرف سے

ہٹالیا۔ اس کو پھر غصہ آنے لگا تھا۔ ”بھائی جان واپس نہیں چلیں گے؟“ جیسے وہ صبا سے پناہ مانگ رہی تھی۔ پروفیسر احسان اور ریاض ایک ساتھ ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بھابی جان گہری گفتگو کے درمیان سے چونک پڑیں۔ اور جب وہ سب کے سب اس سے مل کر موٹروں میں بیٹھ چکے تو وہ سب سے آخر میں شاہینہ کے پاس آیا۔ ”آداب عرض ہے محترمہ، اگر آپ کو مصوری سے کبھی کوئی دلچسپی ہو تو یہ غریب خانہ حاضر ہے۔“ وہی پرانی ہنسی اس کے ملیح چہرے پر چھارہی تھی۔ شاہنہ کی نگاہیں ایک دفعہ اوپر اُٹھیں اور پھر اس کی آنکھیں خود بخود جُھک گئیں۔ ”محترمہ“ شاہنہ کے ہاتھ پر وہ اپنی انگلی سے ٹہوکا دیکے وہ بہت ہی آہستہ سے یہ کہتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ ”تصویر کی کامیابی پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں“ موٹر کے اسٹارٹ کے ساتھ شاہینہ کا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ”شیطان“ رات کے اندھیرے میں وہ تلملا کر رہ گئی۔ احاطے سے نکل کر جب موٹر گھوم کر دوسری سڑک پر جانے لگی تو اُس نے دُور سے دیکھا کہ وہ ابھی تک پورٹکو کی روشنی میں اکیلا کھڑا تھا۔

دوسرے دن صبا دفتر سے واپسی میں اس کو پکڑے ہوئے اپنے ساتھ لے آیا۔ شاہینہ بھائی جان کے دوستوں سے چھپ کر اپنے کمرے میں بیٹھ جاتی تھی مگر وہ تو بھائی جان کے ساتھ سارے کمروں کا معائنہ کرتا پھر رہا تھا۔ سب سے زیادہ اس کو شاہینہ کے

کمرے کی سادگی پسند آئی اور وہ اسی کمرے میں جم کر بیٹھ رہا۔ "مس شاہینہ، اس طرح چپ چاپ زندگی گذارنے کا آپ کو کوئی حق نہیں، مصوری سیکھئے مصوری۔ پھر آپ کو یہ دنیا اس اکیلے کمرے میں خاموش بیٹھے رہنے سے کہیں زیادہ دلچسپ اور سحر انگیز نظر آنے لگے گی۔ سمجھا؟" — "اور بھابی جان، آپ کی یہ لمبی لمبی انگلیاں!" وہ بڑے غور سے بھابی جان کی انگلیوں کو دیکھتے ہوئے بولا "جانتی ہیں آپ، یہ صرف مصوری ہی کے لئے تو بنی ہیں۔ منگاؤں سامان؟"۔ وہ جیسے مصوری کا ایجنٹ بن کر سب کی جان سے چمٹا جا رہا تھا بھابی جان کی خوش اخلاقی مشہور تھی وہ بھلا کیسے انکار کر سکتی تھیں دوسرے دن سے سارے گھر بھر میں قسم قسم کے رنگوں کے بکس مختلف سائز کے برش اور کئی چھوٹے بڑے چوکھٹے جگہ جگہ چھا کر رہ گئے۔ پھر تو ایک اچھا خاصا گھر میں آرٹ اسکول ہی کھل گیا تھا۔ مس شاہنواز لاڈلی اور بھابی جان سب کی سب بڑے انہماک سے مصوری سیکھنے میں لگ گئیں۔ مگر شاہینہ اسی طرح الگ الگ جاوید کے سایہ سے بھی بھاگتی رہی۔ کبھی کبھی اپنے ادھورے شوق کی تکمیل کے لئے اس کا دل تڑپ اٹھتا تھا۔ مگر وہ اپنی انفرادیت اور وقار کو ٹھیس لگانا نہ چاہتی تھی۔ ایک دن جاوید کے کمرے میں وہ اس کی بنائی ہوئی تصویروں کے البم کو بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ جاوید ٹھیک اسی وقت اپنی کوٹھی سے پہنچا، موٹر اتنی آہستگی سے ٹھہری تھی کہ شاہینہ کو

کوئی خبر نہ ہو سکی۔ وہ بڑے ادب اور خاموشی سے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ”محترمہ، خدا کے لئے اب مجھے معاف کر دیجئے۔ اتنی لمبی سزا۔ اب مجھ سے برداشت نہ ہو سکے گی۔“ شاہینہ اپنے اتنے قریب سے اس کی آواز سن کر چونک پڑی ”آپ کا شکریہ“ وہ بڑے طنز سے بولی۔ ”آپ کی بنائی ہوئی تصویر نمائش بھر میں کامیاب ہو چکی ہے، اس سے بڑھکر آپ کو اور کیا خوشی ہو سکتی ہے“۔ جاوید کا چہرہ اور بھی افسردہ ہو گیا۔ ”مس شاہینہ، آپ مجھ سے اس حد تک ناراض ہیں؟“ اس کی خوبصورت آنکھوں میں گہری اداسی چھا گئی۔ ”میں اپنی تنہا اور خاموش زندگی سے تھک کر آپ لوگوں کے درمیان خوشیوں کے کچھ دن گزارنے آ گیا تھا مگر جب آپ مجھ سے اسطرح کھچی کھچی رہیں گی تو پھر میں کیسے یہ دیکھ سکوں گا۔ محترمہ۔ نہیں۔ نہیں مس شاہینہ۔ وہ کتنا برا دن تھا جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی“ شاہینہ کو پہلی بار اپنے ایک مہمان کے ساتھ اپنی بد اخلاقی پر افسوس ہو رہا تھا۔ ”لیکن وعدہ کیجئے کہ آپ پھر کبھی میری تصویر تو نہ لیں گے“ جاوید کو شرط منظور تھی اور پھر اس دن سے دونوں میں صلح ہو گئی۔ شاہینہ کا کمرہ مستقل طور پر ایک نگار خانہ بن گیا، بھابی جان بڑے شوق سے تصویر کشی میں لگی رہتیں۔ مس شاہنواز کو بی اے میں آنرس کی تیاری کرنی تھی۔ کبھی کبھار مس لاولی چیٹرجی آ جاتیں۔ شاہینہ بہت دنوں تک اپنے کالج میں مصوری سیکھتی رہی تھی اسی لئے وہ

اس فن سے ناواقف نہ تھی۔ کبھی کبھی سارا دن شاہینہ، بھابی اور جاوید فوٹو کا کیمرہ، پنسل اور کاغذ کے پیکٹ لئے دور دور تک جنگلوں پہاڑوں اور میدانوں میں پھرتے پھرے۔ مصوری کے ساتھ ساتھ فوٹوگرافی کا بھی ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا تھا۔

شاہینہ تصویر بناتی رہتی اور جاوید آرٹ کی تعریف کئے جاتا "یہ سفید چاند، یہ جھلملاتا ہوا جھیل، اس پر یہ اُجلے اُجلے کنول، یہ چمکتے ہوئے ستارے اور ہر طرف چھائی ہوئی یاسمین چاندنی —— شاہینہ جی چاہتا ہے کہ دنیا بھر کے اُجالے کو اپنی روح میں سمیٹ لوں" اور ہمیشہ اس سے شاہینہ کی اسی ایک طرح کے منظر پر لڑائی ہو جاتی اور وہ چڑھ کر کہتی "مجھکو زندگی کی رنگینیاں پسند ہیں غم کے چرکے نہیں"۔ تصویر بناتے بناتے جب کبھی جاوید کی انگلیاں اس کی انگلیوں کے قریب برش کو سہارا دیتی رہتیں تو اس وقت وہ یہ بھول جاتی تھی کہ وہ تصویر بنا رہی ہے یا خود ہی یہ ایک تصویر ہے، اس کے بعد وہ تنہائیوں میں اُن برشوں، رنگ کے بکسوں اور کاغذ کے پیکٹوں میں، گزرے ہوئے لمحوں کے نقوش ڈھونڈتی رہتی۔ ایسی مبہم تلاش ہی اس کو پسند تھی وہ حقیقتوں سے گریز کرتی ہوئی جاوید کے سامنے اپنی ذرا سی چوک بھی ظاہر کرنا نہ چاہتی تھی۔ بھابی جان کو ایک ہی ساتھ بے شمار کام رہتے تھے۔ مگر جاوید کے بغیر اس کا جی ذرا بھی نہ لگتا تھا۔ اس کے جاتے ہی جیسے سارے کام ایک دم سے ختم ہو جاتے تھے۔ پروفیسر احسان، مس

شاہنواز کو پڑھانے میں لگا رہتا اور اس طرح کئی دنوں سے وہ اُکھڑا اُکھڑا بیزار بیزار سا نظر آ رہا تھا۔ بھابی جان اور صبا کے ساتھ وہ بھی ایک دن جاوید کے یہاں گئی۔ وہ سچ مچ میں ایک خبطی ہی تو تھا جو اتنی بڑی اکیلی کوٹھی میں تنہا اپنے کمرے میں چپ چاپ سے پڑا ہوا تھا۔ اس کے بستر پر بہت سی رنگین اور بے رنگ کی تصویریں ایسی ہی بکھری پڑی تھیں۔ بھائی جان اتوار کا سارا دن گذارنے یہیں آ گئے تھے اور مجبوراً شاہینہ کو بھی ان کے ساتھ آنا پڑا تھا۔

بھابی جان کو جاوید سے بڑی ہمدردی تھی اس کا پریشان حال کمرہ بھابی جان سے دیکھا نہ گیا۔ "شاہنہ" وہ بڑے پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ "دیکھتی ہو بچارہ کا کمرہ ۔۔۔؟ آؤ ہم دونوں مل کر اسے اچھی طرح سے ٹھیک کر دیں"۔ اور بھابی جان گلدان، تصویر اور چند کتابوں کو اِدھر سے اُدھر رکھ کر سارا اکٹا ہوا کمرہ شاہنہ پر چھوڑ چھاڑ کر صبا اور جاوید کی باتیں سننے چلی گئیں۔ بھابی جان کا جانا شاہنہ نے غنیمت ہی سمجھا تھا۔ جاوید کے تکیہ کے نیچے شاہنہ کی بہت سی تصویریں بکھری پڑی تھیں۔ "کیسی پکڑی تمہاری چوری"۔ وہ مسکرا دی، اس کو اپنی ان تصویروں کے کھنچے جانے کی کوئی خبر نہ تھی۔ ساری تصویریں ایسی تھیں جیسے شاہینہ کی بے خبری کے عالم میں لی گئیں ہوں، نہ جانے کیوں اس کو جاوید کی یہ چوری بہت ہی اچھی لگی۔ اس نے ان سب تصویروں کے ساتھ جاوید کی بھی کئی تصویریں اپنے پرس میں

چھپا کر رکھ لیں۔ اور اکیلی ہی کمرہ سجانے لگی۔ چائے میں دیر ہو رہی تھی جاوید خود ہی اسے ڈھونڈتا ہوا پہنچا۔ "ارے آپ؟ آپ یہ کیا کر رہی ہیں محترمہ۔؟ کیوں میری عادت بگاڑ رہی ہیں آپ۔؟ اور جب آپ نے اتنی محنت کر ہی لی ہے تو پھر خدا کے لئے اس کمرے کی ساری چیزوں کو ہمیشہ کے لئے جاوداں کر دیجئے۔" وہ بہت ہی سنجیدگی سے بولا۔ "اوہ۔ آپ کو تکلف کرنا بھی خوب آتا ہے۔ بھابی جان نے مجھ سے کہا۔ میں نے کمرہ ٹھیک کر دیا۔ اور بھلا یہ کام ہی کونسا تھا۔ دیکھئے پرسوں میں نے احسان کا کباڑ خانہ جیسا کمرہ درست کر دیا تھا تو اُس نے تو مجھے شکریہ تک نہ کہا۔" جاوید کی نگاہوں میں جگمگاتے ہوئے فانوس جیسے یکبارگی بجھ گئے۔ احسان اور اس کا کمرہ دونوں شاہنہ کی نگاہوں میں ایک ہی سا تھا۔ اور شاہنہ کو اس طرح سے اُسے ستانا بہت اچھا لگتا تھا۔

صبا کے یہاں احسان کی الوداعی پارٹی تھی۔ سارے دوست ایک جگہ جمع ہو کر اس کو رخصت کرنے والے تھے۔ مس شاہنواز اور لاولی چیٹرجی اسی کی خاطر بہت سویرے سے یہاں آ گئی تھیں۔ مس شاہنواز کا چہرہ اترا ہوا تھا!ور احسان بھی دل گرفتہ سا نظر آ رہا تھا۔ بھابی جان سراپا میزبان بنی پھر رہی تھیں۔ مگر شاہنہ کو کوئی کام نہ تھا۔ وہ بیکار اپنے کمرہ میں بیٹھی سامنے کی سڑک کو تک رہی تھی۔ جاوید کی سفید کار کو آتے ہوئے دیکھکر وہ تیزی سے

پورٹیکو کی طرف بڑھی۔ اُس نے کئی دنوں سے جاوید کو نہ دیکھا تھا۔ اور وہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اپنی موٹر کا پٹ بند کرتے ہوئے جاوید نے اپنا ہیٹ سلام کے لئے اونچا کیا۔ "محترمہ آپ کا بہت بہت شکریہ۔" اس نے اسی طرح ہنستے ہوئے شریر لہجے میں کہا۔ "محترمہ" کہتے ہوئے وہی پہلی سی شرارت اس کی آنکھوں میں رقص کرنے لگتی تھی۔ "یہی ڈیوٹی بہت دیر سے کر رہی ہوں۔ اونہہ۔ اب تو جی بھی گھبرا گیا" وہ صاف جھوٹ بول گئی۔ "تو آپ میرے لئے بھی اسی پابندی کو برتنا پسند کرتی ہیں؟ پھر یہ شکریہ کہاں سے ملتا" اس کی شریر ہنسی کمرے میں گونج گئی۔ "دیکھئے میں آپ کے لئے خاص طور پر ایک پھول لایا ہوں" اس کے ہاتھ میں سفید پھولوں کے کئی گلدستے بھرے ہوئے تھے "لائیے میں خود سے آپ کے بالوں میں اسے لگاؤں گا۔" وہ پھول کی نازک پنکھڑیوں کا ایک سہارا لیتا ہوا اس کے قریب آیا۔ "لیکن آپ۔ آپ مجھے یہ بے رنگ کا ماتمی پھول کیوں دے رہے ہیں۔" شاہنہ کی آواز کانپ رہی تھی۔ جاوید کا ہاتھ آہستہ سے رُک گیا۔ "آپ رو رہی ہیں۔؟" اور اس کی آواز خود ہی لرز رہی تھی

شاہنہ کو آتے ہوئے دیکھکر لاولی مسکرا پڑی۔ "یہ شاہنواز کی طرح تمہاری آنکھیں بھی بھیگتی جا رہی ہیں"۔ جاوید نے بھی شاہنہ کو دیکھا سچ مچ اس کی آنکھیں روئی روئی سی لگ رہی تھیں۔ وہ احسان

کے پاس بیٹھا رہا اور اس کی نگاہیں آسمان کی بلندیوں میں نہ جانے کسے تک رہی تھیں۔

صبا کے سارے دوست آچکے تھے۔ دن بھر کا پروگرام پہلے ہی سے طے کر لیا گیا تھا۔ پہلے پہاڑی کے اوپر ایک چھوٹی سی پک نک کے ساتھ تصویر لی جانیوالی تھی۔ گھر واپس آکر پارٹی تھی اور اس کے بعد کچھ نظمیں گائی جانے والی تھیں۔ سارے لوگ پک نک میں گئے مگر شاہنہ نہ گئی اس کی طبیعت کچھ سُست سی لگ رہی تھی۔ وہ لوگ پک نک سے شام کو واپس آئے۔ شاہنہ اس وقت تک اپنے کمرہ ہی میں تھی۔ جاوید نے آہستہ سے اس کے در کو کھٹکھٹایا۔ "آئیے"۔ شاہنہ کی بہت ہی ہلکی سی آواز آئی۔ "اوہ۔ آپ تھے؟"۔ اس کی آنکھیں شرارت سے چمک اُٹھیں۔ "میں سمجھی کہ احسان مجھ سے رخصت ہونے کو آرہے ہیں"۔ "اور آپ اسی لئے بیمار ہو گئیں" جاوید نے سگریٹ کے دھوئیں کا لچھا بناتے ہوئے بے پروائی سے کہا "کب تک اس طرح سے کھڑے رہیں گے؟ بیٹھئے نا"۔ "مگر آپ تو احسان کا انتظار کر رہی ہیں نا؟"۔ شاہنہ کھل کھلا کر ہنس پڑی "تو اسی لئے آپ اتنے کھچے کھچے سے ہیں؟ بچارہ احسان کتنا اچھا سا آدمی ہے"۔ وہ اپنے بالوں میں سے کانٹے نکال کر میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ "اچھا تھوڑی دیر کیلئے اس کرسی پر بیٹھ جائیے نا"۔ جاوید کا اُترا ہوا چہرہ بڑے پیار سے اس نے تکتے ہوئے کہا۔ جاوید نے آج

پہلی بار شاہینہ کے کمرے میں اتنی نمایاں جگہ پر اپنی تصویر رکھی ہوئی دیکھی تھی، ایک دبی ہوئی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی، اور اس نے شاہینہ کو سلام کرتے ہوئے اپنا ہاتھ اٹھا کر اپنے سر کو ذرا سا جُھکا دیا "اس یاد فرمائی کا شکریہ"۔ شاہینہ اس اچانک حملے سے یکدم گھبرا اُٹھی۔ وہ تجاہلِ عارفانہ سے بڑی بھولی سی بنتی ہوئی بولی۔ "یہ۔؟ یہ مس چیٹرجی کی پسند ہے جاوید صاحب اُنہی کا شکریہ ادا کیجئے"۔ جاوید کی افسردہ آنکھوں میں جیسے تاریک گھٹائیں چھاگئیں اور شاہینہ کے چہرے پر فاتحانہ شرارت ناچ رہی تھی۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ جاوید اس کے لئے کتنا تڑپ سکتا ہے۔ اسی لئے وہ لہکتی ہوئی آگ پر تیل کے چھینٹے ڈال رہی تھی۔ "چلتے ہیں باہر لان میں۔؟۔ آپ کی گھڑی میں کیا بجا ہوگا۔؟" وہ چھیڑ چھیڑ کر اس سے باتیں کر رہی تھی جاوید نے اسی طرح خاموشی سے اس کو تکتے ہوئے اپنے ہاتھ سے گھڑی کو کھول کر میز پر رکھ دیا۔ مگر اچانک جیسے اس کو کوئی بھولی سی بات یاد آگئی تھی۔ اس نے شاہینہ کے ہاتھوں سے گھڑی لے لینی چاہی لیکن شاہینہ پہلے ہی جانتی تھی کہ وہ اس سے اپنی گھڑی کو ہمیشہ چھپاتا رہا تھا۔ گھڑی کے فیتے میں ایک خوبصورت سا لمبا ڈھکنا تھا اور شاہینہ یہ جانتی تھی کہ اس میں کوئی تصویر رکھی ہوئی ہے۔ جیسے ہی ڈھکنا کھول کر وہ تصویر کو دیکھنے لگی تھی کہ جاوید نے چپکے سے جُھک کر اس کی آنکھوں میں دھواں بھر دیا۔ اور جب وہ

اپنی آنکھوں کو ملنے لگی تو جاوید نے اسمیں سے تصویر نکال لی۔ فیتے کا ڈھکنا خالی پڑا تھا۔ "آپ۔ آپ بہت بڑے شریر ہیں" وہ تلملاکر صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ جاوید بڑی سنجیدگی سے چپ چاپ کرسی پر پڑا ہوا صرف سگریٹ پیتا رہا۔ "تو آپ یہ آج اسی طرح منہ سوجائے رہیں گے" شاہنہ کے لبوں پر ہنسی لہرائی۔ "کیا یہی کہدوں؟ جھوٹ موٹ کہ آپ بہت ہی خوبصورت ہیں بڑے اچھے سے لگتے ہیں اسی لئے ٹھیک اپنی نگاہوں کے سامنے آپ کی تصویر لگا رکھی ہے"۔ مگر جاوید اسی طرح خاموش تھا۔ اس کی نگاہیں جیسے شاہنہ کے چہرے پر جم کر رہ گئیں تھیں۔

پارٹی ختم ہوگئی تھی گانے گائے جا رہے تھے مگر جاوید اسی طرح بجھا بجھا ہوا سا تھا۔ سارے لوگوں کو جاوید کی افسردگی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر وہ تو ایک ہی خبطی تھا جس کے رونے اور ہنسنے کی کوئی پابندی نہ تھی۔ روفی نے بھابی جان کی فرمائش کا ایک گانا گایا اور ستار انور کے ہاتھوں میں دیدی۔ مگر انور کو گانا نہ آتا تھا اس نے ستار جاوید کی طرف بڑھا دیا۔ جاوید اپنی نظموں کو بڑے پُراثر انداز میں ستار پر گایا کرتا تھا۔ سارے لوگ کرسیوں پر خاموش بیٹھے تھے۔ رات کے ہوتے ہوئے اندھیرے میں چاند کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔ شاہنہ مس چٹرجی کے ساتھ سب سے دور الگ تھلگ بیٹھی ہوئی تھی۔ ستار کے ایک دو تار زور سے تھرتھرائے۔

اور پھر وہ دھیرے دھیرے نغموں کو لئے ہوئے جیسے فضاؤں میں ڈوبتے جا رہے تھے۔

اس چاند کو اپنا کہہ نہ سکے
اس پھول کو ہم اپنا نہ سکے
جس کیف چمن میں کھوئے تھے
اس باغ کو اپنا بنا نہ سکے

وہ اس طرح سے گا رہا تھا جیسے اس کی روح غم سے نڈھال ہوتی جا رہی ہے اور اس کی سیاہ پلکیں سچ مچ آنسوؤں سے بوجھل ہوگئیں تھیں۔ احسان کی موٹر جب جا چکی تو سب کے سب رخصت ہونے لگے۔ جاوید سب سے مل کر شاہنہ کے پاس آیا۔ "اچھا، خدا حافظ شاہنہ"۔ اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے زور سے اس کی انگلیوں کو دابا۔ "خدا حافظ" شاہنہ آہستہ سے بولی۔ اور اس کے بعد جاوید کی سفید چمکتی ہوئی کار اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی ـــ وہی شاہنہ کی جاوید سے آخری ملاقات تھی۔ وہ ایسے اچانک طور پر کہیں چلا گیا تھا کہ کسی کو خبر نہ ہو سکی تھی کہ وہ کہاں اور کیوں اس طرح سے چلا گیا تھا۔ صبا اور اس کے سارے دوست تو اس کو پہلے ہی سے پاگل کہہ رہے تھے۔ تو کیا وہ سچ مچ صرف ایک خبطی ہی تھا؟ شاہنہ کی غمگین نگاہیں اس کی واپسی کا راستہ تکتے تکتے جب تھک گئیں تو اس نے اس ساری یادگار چیزوں کو

الماری میں اس طرح سے بند کر دیا کہ جب وہ خود ہی بھلا دی گئی تھی تو پھر وہ اپنے کو بھول کر ان ساری باتوں کو بھول جائے۔ مگر دو سال کے اتنے لمبے عرصے میں بھی وہ جاوید کو بھلا نہ سکی تھی وہی گذری ہوئی یادیں تو اسکی زندگی کا سرمایہ تھیں۔ اور اتنی مدت پر وہ اس سے ملنے کے لئے آ رہا تھا۔ اپنا کمرہ جب وہ درست کر چکی تو اس نے بہت سے سفید پھولوں کے ہار خود ہی سے گوندھے اور سفید پھولوں کے کئی گلدستے بھی بنائے۔ سارا گھر سنسان پڑا تھا۔ اور وہ بے جھجک جو چاہتی تھی کر سکتی تھی۔ سفید ہی پھول تو جاوید کو پسند تھے۔ شاہنہ نے اس کی ایک ایک تصویر میں پھولوں کے کئی کئی ہار پہنائے تھے۔ اس نے سارے کمرے کو یاسمیں رنگ کے پھولوں سے سجایا، اور خود بھی سفید کپڑے میں ایک یونانی مجسمہ لگ رہی تھی۔ کتنے زمانے پر وہ اتنی خوش ہو رہی تھی ـــ اتنے بڑے مکان میں اکیلے انتظار کا وقت گزارنا شاہنہ پر کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ وہ بار بار گھڑی کو دیکھتی جا رہی تھی اور اس کی نگاہوں میں وہ گزرا ہوا آخری دن یاد آ رہا تھا۔ "کیا اب بھی اس کی گھڑی کے فیتہ کے ڈھکنے میں اس کی تصویر چھپی ہوئی ہوگی؟۔ اس کی ان شریر آنکھوں میں ابھی تک شاہنہ کا تصور چھپا تا ہوگا؟ اچانک موٹر ٹھہرنے کی آواز سنکر وہ پورٹیکو کی طرف بڑھی "ـــ آداب عرض ہے محترمہ!" وہی لطیف سی مسکراہٹ اسکی آنکھوں

میں ابھی تک لہرا رہی تھی۔ "یہ محترمہ شاہنہ صاحبہ، آرٹسٹ ہیں، اور یہ مسز جاوید"۔ وہ ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھ رہے، یک بیک شاہنہ کا دل زور زور سے دھڑک کر جیسے ڈوبنے لگا۔ وہ سارے جسم سے کانپ رہی تھی اور اس کی آنکھوں کے آگے چھاتے ہوئے اندھیرے میں سامنے دو پھٹی پھٹی بیمار آنکھوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکلوں سے اپنے کو سنبھالا۔ "مسز جاوید آپ کی تشریف آوری کا بہت بہت شکریہ" اس نے بڑے تکلف سے جھک کر کہا۔ اور اس کی لڑکھڑاتی ہوئی نگاہیں یک بیک اس کے جسم کے سفید سفید چپرکوں پر حیرت سے پھسلنے لگیں۔ اس کو یکدم سے یاد آیا کہ جاوید کو سفیدی اور اُجالے کتنے عزیز تھے۔ تو کیا برص کے ان سفید چپرکوں سے اس نے اپنی روح کو روشن کر لیا ہوگا؟ اتنی دیر میں جاوید گھبرا گیا تھا۔ "او شاہنہ اب تکلف کو ختم بھی کرو۔ میں خود ہی یہاں کا میزبان ہوں۔ صبا اور بھابی کہاں ہیں سب؟ اور یہ — تمہیں۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ بیمار تھیں کیا شاہنہ۔؟" آج پہلی بار وہ اتنی بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا۔ اور شاہنہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس سے سارا احساس یکبارگی چھین لیا گیا ہو۔ وہ پتھر کی صرف ایک بے جان سی مورت تھی، وہ اپنے کمرے میں ایک بیمار کی طرح لڑکھڑاتی ہوئی آئی۔ کمرے کی ساری چیزوں کو دیکھکر اس کے مردہ احساسات اچانک طور پر بیدار ہوگئے

وہ اُن ساری چیزوں سے لپٹ لپٹ کر رونا چاہ رہی تھی۔ کہ اسی کمرے میں جاوید آ گیا۔ "شاہنہ تم نے مجھکو شادی کی مبارکباد نہیں دی"۔ وہ اسی طرح ہنستا ہوا بولا۔ "مبارک باد دینے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ آپ نے شاید بڑی عجلت میں شادی کی ہے۔" شاہنہ کے الفاظ کانپ رہے، "یا انتہائی محبت میں آپ دیوانے ہو رہے ہوں"۔ ایک بجھا ہوا تبسم شاہنہ کے لبوں پر آیا۔ "شاہنہ اپنی محبت میں تو میں ناکامیاب رہا ہوں ـــ لیکن مجھ سے پہلی بار یہی محبت کی گئی تھی اور اس مجبور محبت کی پیشکش کو ٹھکرانے کی مجھ میں جرأت نہیں تھی ـــ اپنا ہی درد محسوس کرنے لگا"۔ غمناکیاں اس کی نگاہوں تڑپ رہی تھیں۔

وہ شاہنہ کے کمرے کو حیرت زدہ ہو کر دیکھ رہا تھا۔ گذرے ہوئے دنوں کی چھوٹی سی چھوٹی چیزوں کو شاہنہ نے یادگار بنا کر محفوظ رکھا تھا۔ اور اس کی تصویریں دیوتاؤں کی طرح پھولوں سے لدی ہوئی تھیں۔ وہ یک بیک جیسے کسی گہری نیند سے جاگ اُٹھا۔ کمرے کی خاموشی میں پھولوں سے لدی اس کی مسکراتی ہوئی تصویریں جیسے اسی پر ہنس رہی تھیں، ہوش میں آتے ہوئے ایک بے ہوشی کے عالم میں وہ اپنی بھیگی ہوئی یاس آگیں نگاہوں سے شاہنہ کے تھرتھراتے ہوئے خاموش لبوں کو تک رہا تھا۔ اور شاہنہ کی آنسوؤں سے ڈبڈبائی سوگوار آنکھیں

دریچہ سے باہر سامنے خلاء میں نہ جانے اب کس ڈھونڈ رہی تھیں ——————

بُزدل

سائے تاریک ہوتے جا رہے تھے اور وہ بے بسی سے اسی اندھیرے میں گھٹ جانا چاہتی تھی۔ اسے محسوس ہوتا جیسے کسی اتھاہ سمندر میں لاحاصل ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ ساحل کا کوئی پتہ نہیں، اور اُسے تیرنا نہیں آتا۔ اس کا تھکا ہوا جسم شل ہوا جا رہا تھا اور اسے ایسا لگ رہا تھا کہ پانی کی سطح پر یہ چند اُبھرتے ہوئے بلبلے بھی جلد ہی ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گے اور ہر طرف تاریکیاں ہی باقی رہ جاتی تھیں۔

اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کبھی کبھی اس کی نگاہوں کے آگے بجلیاں سی کوند جاتیں۔ مبہم امید کی چند کرنیں اس کے دل کے

درزوں میں سے جھانکتیں۔ کچھ مدھم سے نقوش اُبھرتے۔ اسے دُھندلا دھندلا خواب سا یاد آتا اور جب اُس کا دل بُری طرح گھبرانے لگتا تو وہ اُنھیں مٹتے ہوئے نقوش کو اپنی نگاہوں کے موئے قلم سے تخیّل کے پردے پر اُبھارنے لگتی۔ پھر وہ رنگینیوں میں ڈوب جاتی۔ کیفِ خمار کے احساس اوّلیں میں پہلی پہلی جذبات کی دبی ہوئی لذتیں اسے یاد آتیں۔ جب وہ ایک سرور محسوس کرنے لگی تھی اس نے زیدی کو پہلی بار دیکھا۔ پہلے وہ اس نوائے سروش سے بے خبر تھی جو زیدی کی نگاہیں اسے سنا رہی تھیں۔ اس نے کچھ نہ سمجھا کہ دُنیا اتنی حسین کیوں ہو گئی ہے۔ رفتہ رفتہ اس نے محسوس کیا۔ وہ یکایک چونکی مگر سنبھل نہ سکی۔ زیدی بہار بن کر آیا اور اس پر چھا گیا شمع اپنے دل کی پُرخلش لذتوں کو چھپائے زیدی سے ملتی رہی۔ پہلے خاموش کھنچی کھنچی سی۔ جھکی ہوئی پلکوں سے وہ بس اتنا ہی محسوس کر کے خوش ہو لیتی کہ زیدی ابھی اسکے پاس ہے مگر وہ کچھ زیادہ دنوں تک اپنی دلی کیفیتوں کو چھپا نہ سکی۔ طوفان کی زد میں ڈالیاں جھومے بغیر کیسے رہ سکتی تھیں۔ اس نے کچھ نہ جانا کہ اسے کیا کرنا ہے اور اس خود فراموشی کی حالت میں وہ کچھ جاننا بھی نہ چاہتی تھی۔ والہانہ طور پر اسے خیال ہوتا کہ زیدی اس سے محبت کر رہا ہے۔ پھر بھی وہ اپنی روح میں ایک خلا محسوس کرتی، جیسے اسے کسی چیز کا انتظار ہو۔ شمع نے انجان رہ کر محسوس کیا تھا کہ زیدی اکثر کئی کئی

بہانہ سے صرف اس سے ملنے آتا ہے۔ ایک بار سنگر مشین پر جھکی ہوئی وہ کچھ سی رہی تھی۔ ہنڈل زور زور سے چل رہا تھا۔ اسے اس تنہائی میں بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ جس طرح سِلتے ہوئے کپڑے تیزی سے پیچھے بھاگتے جا رہے تھے اسی طرح اس کی آنکھوں کے آگے سے بھی کتنی یادگار باتیں گذرتی جا رہی تھیں وہ مشین کو اور بھی تیز تیز چلانے لگی۔ اس کے جسم کے ہر ہر بند اور جوڑ جوڑ میں ایک طوفان بپا تھا وہ مشین کو اتنے زور سے چلانا چاہ رہی تھی کہ اُس کے ایک ایک پرزے اپنی جگہ سے ہل ہل اٹھیں۔ اُس کا دل ایک سیلاب کیطرح امڈ جانا چاہتا تھا۔ اور وہ ساحل سے ہم آغوش ہو جانے والی لہروں کا ترنم سننے کو بیتاب تھی۔ وہ گھبرائی گھبرائی خوفزدہ سی رہتی پھر بھی کبھی کبھی اس کا دل مسرور لگتا اور اس کی نگاہیں ایک خوش آگیں۔ خواب دیکھنے لگیں، کبھی دُھندلا اور کبھی صاف، روشن چمکیلا سا خواب۔

وہ مشین پر جھکی زور زور سے ہنڈل چلاتے چلاتے تھک گئی تھی۔ اس کے کندھوں میں درد ہونے لگا تھا اس نے سر اٹھا کر اپنے گرد گھری خاموشی کو محسوس کیا اور تنہائیوں سے اکتاتے ہوئے مشین کو پھر تیز تیز چلانے لگی۔

مکان کے ایک حصّہ سے گھر کے لوگوں کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں کبھی کبھی گفتگو کا کوئی دلچسپ حصہ بھی سنائی دیتا، وہ پھر بھی

اپنی سلائی میں مشغول تھی دوسرے کمرے میں اس کا بھائی خاموشی سے اپنی کتابوں میں غرق تھا، کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سفید پینٹ کی مہری اور سیاہ بوٹ اسے نظر آیا مگر وہ سر جھکائے اسی طرح سیتی رہی۔ زیدی کی آواز سن کر شمع چونکی وہ کہہ رہا تھا کہ "رات اپنی آنے والی کتابوں کی رسید وہ شاید یہیں کہیں بھول گیا ہے" چکر لگاتا ہوا ہنڈل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اس کے بازو میں اینٹھن ہونے لگی تھی، زیدی اس کے قریب ہی آکر بیٹھ گیا سلے ہوئے کپڑے کو الٹ پلٹ کر وہ ہنستے ہوئے شمع سے کہنے لگا کہ "وہ اس سے کہیں بہتر سلائیاں کر سکتا ہے" پھر مشین کو چلاتے ہوئے بولا کہ "کالج کے بعد وہ ایک ٹیلرنگ ہاؤس، کھولے گا جہاں طرح طرح کی سلائیاں ہونگی۔" ہنڈل زور سے چکر لگا رہا تھا سلائی ٹیڑھی ہو رہی تھی اور کپڑا مشین کے دانتوں سے بہکا جا رہا تھا، گھن گھن کی تیز آواز گونج رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں زیدی چلا گیا۔ شمع نے اپنے دل کو یقین دلانا چاہا کہ زیدی صرف اس سے ملنے کے لئے آیا تھا، زیدی نے جاتے ہوئے کہیں پر بھی اپنی کتابوں کی رسید نہیں ڈھونڈی تھی، شاید وہ یہی بتانے آیا تھا کہ اس کی روح میں بھی ایک زلزلہ آچکا ہے۔ مگر شمع چاہتی تھی کہ زیدی اسے یہ بتا دے کہ وہ اسکو بغیر دیکھے ہوئے نہیں رہ سکتا ہے۔ وہ اکثر سوچتی "کیا یہ سچ ہے" وہ جیسے تاریکی میں کسی چیز کی متلاشی تھی پھر بھی اس کے دل کو غائبانہ طور پر محسوس ہوتا کہ زیدی

اس سے محبت کر رہا ہے، وہ اس کی نگاہوں کو ٹٹولتی، اس کی ہر ایک کیفیت کو دیکھتی اس کی ساری باتوں پر غور کرتے ہوئے اُسے کسی چیز کو پا لینا تھا، کبھی کبھی زیدی کی خاموش نگاہوں کی گہرائیوں میں اس کے دل کا سراغ ملتے ملتے رہ جاتا اور اسے ایسا لگتا جیسے "لکا چوری" کھیلتے ہوئے وہ اپنا گھونٹا چھوتے چھوتے رہ گئی ہو۔

وہ زیدی کی خاموش نگاہوں کی خلش کو محسوس کرتے ہوئے بھی اس کی محبت کی بیتابانہ اقرار کی خواہشمند تھی، وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا دل کیوں صرف اتنی سی بات، لبوں کی ایک ہلکی سی جنبش اور تھرتھراتے ہوئے لفظوں کی تھوڑی سی پُر معنی گونج سننے کے لئے بے چین ہے۔ بس اسے اتنا معلوم تھا کہ اس کی روح مضطرب ہے، بعض دفعہ وہ اپنی اس لطیف محبت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتی ہوئی اسکی تھاہ لینے لگتی تو پھر اُسے لگتا جیسے وہ تپتے ہوئے صحرا میں اکیلی بھٹک رہی ہے۔ وہ کچھ سمجھی اور کچھ سمجھنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ اچانک طور پر زیدی اس سے جدا ہو گیا ایک لا محدود عرصے کے لئے وہ چلا گیا۔؟ دل کی گہرائیوں میں بیتابانہ خلش بار بار اس سے سوال کرتی "کیا زیدی کو اس سے کوئی لگاؤ بھی نہ تھا، کوئی انس تک نہیں"؟ اور جب کچھ بھی تھا تو پھر اس طرح وہ یکایک چلا کیوں گیا؟ شمع نے اسے شاید غلط سمجھا تھا، وہ تھوڑی سی باتوں کو اپنی نگاہوں کی بھول تو سمجھ لیتی مگر وہ زیدی کی کتنی باتوں کو بھلا سکتی تھی، روح

اور دل کے ٹکڑوں کی جھنکار سے کھیلنے والے زیدی کو وہ کبھی یاد نہ رکھنا چاہتی تھی مگر جب زیدی اس سے دُور جا چکا تھا تب شمع نے سمجھا کہ وہ کنارے کی حد تک پہونچ چکی ہے۔

گھر بھر سے الگ تھلگ جیسے ننھی لڑکیاں ایک کونے میں بیٹھی قسم قسم سے اپنی گڑیاں سنوارتی رہتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح شمع اپنے افسانے اور اپنی نظموں کی رنگین دنیا میں مسرور تھی۔ وہ مصوّر نہیں تھی مگر اپنے ادب کے پردے پر زیدی کی کتنی ہی بولتی ہوئی تصویریں بنا چکی تھی۔ جب وہ اپنی تنہائیوں سے گھبرا جاتی تو صرف وہ اپنے کو بہلانے کیلئے افسانے لکھتی، شوخ رنگین اور رومانی افسانے، جہاں زیدی خاموش نہ رہتا۔ اس کی روح کا خلاء مٹتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے سکون کی دنیا تلاش کر لی تھی۔ گذری ہوئی نگاہوں کی داستان مسلسل اور خاموشیوں کی بس ایک ہی تھکا دینے والی یاد سے وہ تنگ آ چکی تھی۔ اب جیسے بھی اس کا جی چاہتا زیدی اس سے باتیں کرتا رہتا۔ گھنٹوں طرح طرح کی باتیں، ادب کی لامحدود دُنیا اس کے سامنے تھی اور اس کے افسانے فردوس بداماں تھے۔ اس نے اپنی تڑپتی ہوئی روح کو برومائڈ اور اسپرو دیکر بہلانا چاہا اور وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئی تھی۔

ایک طویل عرصہ گذر گیا، شمع کی نگاہوں میں اب زیدی کا تصور بھی دُھندلا ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ دیر تک زیدی کی دیکھی ہوئی صورت کو یاد کرتی مگر اس کو خواب میں دیکھے ہوئے مبہم عکس کے

سوا کچھ بھی یاد نہ آتا۔ پھر بھی وہ زیدی کو بھلا نہ سکتی تھی۔ گذرے ہوئے ایک ایک دن اس کے افسانوں میں یادگار بن چکے تھے مگر جیسے کلورافارم کی بیہوشی کے بعد ہوش آتے ہوئے شدید تڑپ کا احساس ہوتا ہے اسی طرح اپنے رنگین افسانوں سے اُکتا کر شمع کا دل مضطربانہ چیخ اُٹھتا۔ "کاش کبھی تو ایسا ہوتا" پُرخلش حسرتوں کے ساتھ بھی وہ اپنے ادب کی رنگین دُنیا سے الگ نہ ہو سکی۔ اس کی تسکین کا بس یہی تو ایک سہارا تھا اور اس سہارے کے بغیر وہ کیا کرتی۔

یکایک شمع نے ایک تکلیف دہ حقیقت کو محسوس کیا۔ اس کے اپنے افسانے کے عزیز ترین زیدی کی ٹھیک اسی طرح ایکٹنگ کرتا ہوا تنویر اس کی روح پر چھا جانا چاہ رہا تھا۔ وہ شمع کا دُور کا ایک عزیز تھا۔ شوخ، طرّار، فلمی گانوں کا شوقین، اپنی دلی تمناؤں کی طرح طرح سے نمائش کرنیوالا۔ بے جھجک تنویر تیزی سے اس کی طرف بڑھتا ہوا چلا آرہا تھا۔ شمع کے رنگین افسانوں کے شوخ کردار سے شاید اُسے غلط فہمی لگی تھی۔ تنویر کو ادب سے کوئی لگاؤ نہ تھا مگر جب سے اس نے زیدی کی تصویر سے اپنے اپنے قہقہوں کی گونج سُنی تھی تب سے وہ ادب نواز بن گیا تھا۔ وہ شمع کے تنہائیوں میں دیکھے ہوئے خوابوں کو حقیقت سے بدلنے کو روز نئے نئے سوٹ پہن کر آتا۔ شمع کو کبھی اس سے کسی قسم کی دلچسپی نہ رہی تھی مگر تنویر کو کسی پذیرائی کی ضرورت نہ تھی۔ وہ شمع کے افسانے پڑھکر ساری باتوں کو سمجھ چکا تھا۔ تنویر کی رنگین ٹائیوں کو دیکھتے ہوئے

شمع کا دم الجھنے لگتا، جیسے ٹائی کی گرہ خود اس کی گردن میں پیوست ہوتی جا رہی ہے۔ شمع نے کبھی تنویر کی پیشکش کو قبول نہ کیا۔ اس کو تنویر سے ایک چڑ ہو گئی تھی۔ مگر تنویر ایک سطحی کھلا تھا وہ شمع کے دل کی گہرائیوں کو کیا جان سکتا تھا۔ تنویر شمع کی زندگی کے لئے ایک نشتر بن گیا تھا، وہ اس صورت میں زیدی کو بھلا بھی تو نہ سکتی تھی۔ آخر تنویر کی چڑ سے اس نے اپنا لکھنا بند کر دیا، اسے اپنے افسانوں سے خود ہی وحشت ہونے لگی تھی، اپنے بنائے ہوئے کھلونے بھی اس کے اپنے نہ رہے تھے، وہ اکیلے میں خود کو تسکین دینے کے لئے صرف ڈائری لکھنے لگی، زیدی کی شوخ بولتی ہوئی نقلی تصویر بنا کر اس نے اپنے کو فریب دینا چاہا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ اس دفعہ وہ رنگین برشوں کو پھینک کر پنسل اسکیچ سے ہو بہو زیدی کی اپنی تصویر بنانے لگی۔ اب اسے ایک گونہ قرار ملا تھا۔ وہ تنویر سے انتقام لے کر خوش تھی مگر تنویر ان باتوں سے بے خبر تھا۔ اس کی آنکھیں کتنی ہی فلموں کو جذب کر چکی تھیں۔ اس نے روٹھی ہوئی منزل کے ان گنت مناظر دیکھے تھے اسے ہر گھڑی ہر موسم کے فلمی گانے یاد تھے جنہیں یاد کرنے کو اس نے کالج کے لیکچروں کو سننے سے زیادہ اہمیت دی تھی۔

خاندان کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے تنویر کو ہر طرح کی آزادی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس کی شرکت ضروری سمجھی جاتی وہ لوگوں کی دلچسپیوں کا مرکز تھا۔ طرح طرح کے لطیفے اور قسم قسم کے

گانوں سے وہ سب کا ہر دلعزیز بن چکا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ شمع کے گھر پر چھا گیا اور شمع اپنی امید کے چراغِ شکستہ کی مدھم کرنوں کو ایک ایک کرکے مٹتے ہوئے بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ اندھیرے بڑھتے ہوئے آ رہے تھے اور شمع آہستہ آہستہ ان تاریکیوں میں غرق ہوتی جا رہی تھی

شمع گھر کے سارے لوگوں کے ساتھ گنگا کے اُس پار بوٹنگ، میں گئی مگر تنویر کی محبت کے بے جا اظہار سے چڑ چڑی ہو کر وہ جلد ہی وہاں سے اکیلی واپس لوٹ آئی اپنے کمرے میں جاتے ہوئے اُسے یک بیک خیال ہوا زیدی کئی بار یہاں سے گذرا تھا اور اب وہ اس وقت کہاں ہوگا! تنویر نے جیسے اس کے دل کے زخموں کو اپنے ناخن سے کھرچ دیا تھا۔ جب وہ کمرے کے اندر پہنچی تو بجلی کی تیز روشنی میں اچانک اس کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ اُس کو خواب سا لگا۔ وہ دیر تک دیکھتی رہی۔ اس کی متحیر بھوگی نگاہیں زیدی کو ہمیشہ کے لئے اپنے میں جذب کر لینا چاہتی تھیں۔ وہ بالکل پہلے جیسا تھا۔ وہی مخصوص پرانی مسکراہٹ ابھی تک اس کے لبوں پر کھیل رہی تھی مگر نگاہیں پہلے سے کچھ بے باک اور شوخ نظر آ رہی تھیں۔ وہ زیدی سے ملنے میں ذرا بھی نہ گھبرائی۔ اسے اپنی پہلی چوک یاد تھی وہ اپنے افسانوں میں ان راستوں سے ہوتی ہوئی کہیں آگے تک پہنچ چکی تھی وہ بے جھجک مسلسل باتیں کرتی ہوئی یہ بتا دینا چاہتی تھی کہ اتنے عرصے میں کتنی بدل جا چکی ہے۔

زیدی شمع کا مہمان تھا اُسے اپنے کالج سے کوئی سرٹیفکٹ لینا تھا۔

شمع اپنے ہاتھوں سے زیدی کی ساری چیزیں ٹھیک کر چکی تو دیر تک غیر شعوری طور پر وہ زیدی کی ٹائی سے کھیلتی رہی۔ خواب اور بیداری کے درمیان اُس کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا گھر کے سارے لوگوں نے بڑی خوشی سے زیدی کو خوش آمدید کہا۔ زیدی کی خاموشی اب دور ہو چکی تھی وہ دیر دیر تک دلچسپ باتیں کرتا رہتا۔ زیدی نے تنویر کے گانے سُنے اور گھر کے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی تنویر کا دوست بن گیا۔

شمع دور رہ کر زیدی کی نگاہوں کو محسوس تو کر رہی تھی، وہ دیکھتی تھی کہ زیدی دوسرے لوگوں سے مل کر اس سے باتیں کر لیتا ہے مگر وہ تنہائیوں میں شمع سے بولنے میں لڑکھڑانے لگتا۔ شمع اس کے کمرے میں جاکر اسکی ٹائی اور ہیٹ سے کھیلتی ہوئی جب طویل گفتگو چھیڑ دیتی تو زیدی کا گھبرایا گھبرایا پریشان سا چہرہ دیکھکر اسے ہنسی آجاتی اکیلے میں چپ چاپ زیدی کی ساری چیزوں کو الٹ پلٹ کر وہ دیکھتی رہتی اسے زیدی کی ہر ایک چیز سے پیار لگتا اور وہ ان چیزوں میں زیدی کی گہری پوشیدہ محبت کا سراغ ڈھونڈنا چاہتی تھی مگر کہیں نہ پا سکی۔

اپنے چھپے ہوئے افسانوں کے سارے پرچے اس نے ایک دن زیدی کے میز پر رکھ دیئے۔ دوسرے دن جب زیدی کو صبح بخیر کہنے گئی تو وہ اُسے دیکھتے ہی مسکرا کر بولا۔ "اب تو آپ بہت بڑی افسانہ نگار بن گئی ہیں۔" شمع چونک اٹھی، اس کے جذبات کا سیلاب

ایک دھارا باندھ کے رِستے ہوئے درازوں سے بہہ نکلا تھا۔ وہ زیدی کو تکتی ہوئی ہنس پڑی۔ "وہ افسانے نہیں ہیں زیدی صاحب اپنے لئے کچھ کھلونے بنائے ہیں میں نے۔"

"کھلونے ــــــ!"

"ہاں۔ میں اِن سے کھیلتی ہوں جب میرا جی گھبرانے لگتا ہے تب۔"

"مگر کہاں سے لاتی ہیں اتنے سارے خیالات؟" زیدی نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے افسانہ لکھتے ہوئے کبھی کچھ نہ سوچا۔ گذری ہوئی باتیں یاد آتی گئیں اور جو کچھ بھی محسوس کیا لکھتی گئی ــــــ آپ انھیں افسانے کہتے ہیں؟ اور میں کہتی ہوں میرے کھلونے ہیں یہ۔" وہ ایک خود فراموشی کی حالت میں بولتی چلی گئی۔

"کیسے اتنی باتوں کو یاد کر کے لکھ لیتی ہیں آپ؟ میں تو جب کبھی کچھ سوچتا ہوں تو عجیب حالت ہو جاتی ہے میری۔ سارا جسم تپتا ہوا گرم گرم محسوس ہوتا ہے۔ اور پھر میں پسینے سے بھیگ جاتا ہوں۔ اسی لئے کچھ یاد کرتے ہوئے بھی میں ڈرتا ہوں۔ کس سے یہ نہیں جانتا۔ شاید خود ہی ڈر جاتا ہوں میں ــــــ!" زیدی کی آنکھیں بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھیں اس کا چہرہ اس وقت تمتمایا ہوا تھا، شمع دیکھ رہی تھی کہ جیسے وہ اپنی منزل پر پہونچ رہی ہو۔ وہ بہت کچھ سُننے کو بیتاب تھی

مگر زیدی خاموش ہو چکا تھا ۔۔ وہ اپنے قریب ہی تنویر کی آواز سن کر چونکی ۔ تنویر کی مسکراتی ہوئی آنکھیں اسے فاتح نظر آ رہی تھیں، شاید اس لیے کہ زیدی کچھ نہ بول سکا تھا ۔

ایک روز تنویر زیدی کو اپنے ساتھ لیے ہوئے شمع کے پاس آیا، شمع کو میز پر جھکے ہوئی کچھ لکھتے ہوئے دیکھکر تنویر خوش ہو کر زیدی سے کہنے لگا: "آپ نے پڑھے ہیں شمع کے افسانے؟ حقیقت نگار ادیب دیکھیئے ایسے ہی ہوتے ہیں" شمع کو لگا جیسے اس کے سارے افسانے تنویر کی ٹانگوں سے لپٹے ہوئے زیدی اور خود اسکا منہ چڑا رہے ہیں، وہ تڑپ کر بولی: "حقیقت نگار کوئی بھی نہیں ہوتا سبھی جھوٹ لکھتے ہیں! جھوٹ ۔۔ اپنے کو صرف تھوڑی دیر کے لئے فریب دینے کو ۔۔ اور میں نے تو کب سے افسانہ لکھنا چھوڑ دیا ہے" !

"چھوڑ دیا" تنویر کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا اور جب تنویر وہاں سے چلا گیا تو زیدی نے آہستہ سے پوچھا ۔ "آپنے افسانہ لکھنا چھوڑ کیوں دیا" ۔۔ ؟

"اس لئے کہ کہاں تک اپنے کو فریب دیتی ۔" وہ کانپ رہی تھی ایک طرح بے حس، خاموش اور ساکت تصویر دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں بیزار ہو چکی تھیں ۔ وہ چڑچڑی ہو رہی تھی ۔ اس کی رگوں کا خون جیسے ابل رہا تھا آج وہ زیدی سے سب کچھ کہہ دینا چاہ رہی تھی، وہ ایک پاگل کی طرح زیدی کو تکتی ہوئی بے بسی سے بولی "میرے افسانے

نقلی تھے۔ میں نے سراب کو دریا بناکر اس سے اپنی پیاس بجھانی چاہی تھی"۔ اس کی آواز تھرتھرا رہی تھی "میں بتاؤں کہ حقیقت نگاری کسے کہتے ہیں۔ لیجئے یہ میری ڈائری! شاید اسے پڑھ کر آپ مجھے سمجھ سکیں گے" اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے ٹپک پڑے اور ڈائری اس کی کانپتی ہوئی انگلیوں کے درمیان لرز رہی تھی —— شمع اپنی پرنم نیچی نگاہوں سے زیدی کو ڈائری پڑھتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ زیدی کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور پسینے اسوقت بھی اس کی پیشانی پر چمک رہے تھے۔ زیدی نے ڈائری کو پڑھکر میز پر رکھدیا اور اس کی گہری خاموش بے بس نگاہیں شمع کی آنکھوں پر جم کر رہ گئیں۔ شمع نے زیدی کی مضطرب مگر خاموش نگاہوں کو محسوس کیا وہ تھک کر جیسے نڈھال ہو رہی تھی اس کا سر چکرا رہا تھا اس کو میز، زیدی ڈائری اور کمرے کی ساری چیزیں گھومتی ہوئی لگ رہی تھیں اس کے پیر کانپنے لگے۔ شمع نے یکایک گرتے ہوئے کسی چیز کا سہارا لینا چاہا کہ اچانک اسے اپنے کندھے پر موٹی موٹی انگلیوں والا تنویر کا بھدا سا ہاتھ محسوس ہوا اس نے چونک کر پیچھے دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ کمرے کی گہری خاموشیوں سے اکتا کر اس کا جی چیخ چیخ کر رونا چاہ رہا تھا وہ جلد سے جلد اس جگہ سے بھاگ جانا چاہتی تھی، زیدی کی تکتی ہوئی بے بس آنکھیں اور اسکے کانپتے ہوئے خاموش ساکت لبوں کو نفرت سے دیکھتی ہوئی کمرے سے جاتے ہوئے وہ چڑ کر آہستہ سے بولی —"بزدل —!"

مدّوجزر

پسینے سے تربتر، گیت ڈھول اور پُرشور ہنگاموں سے گھبرائی ہوئی نجمی نے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے اندر صدر دروازے کے پیچھے سے چھُپ کر ایک ناقدانہ نظر باہر احاطے میں ڈالی۔ کوٹھی کے سامنے سڑک پر اور جگہ جگہ تاڑ، شیشم اور دیگر درختوں میں کیل سے لگی ہوئی رنگین ڈوریوں سے چپکی ہری، نیلی، پیلی اور سُرخ رنگ کی کاغذی جھنڈیاں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ ”اندر“ آنے اور ”باہر“ جانیوالے دونوں پھاٹکوں کے درمیان چکّر لگاتی ہوئی سُرخ رنگ کی سڑک کے کنارے چُونے سے پُتتے ہوئے سفید براق اینٹوں کے سِنگھاڑوں کے ساتھ ساتھ پیٹرومیکس کی قطاریں دُور سے شالامار باغ کے سلسلہ وار فوّاروں کی طرح

نظر آ رہی تھیں۔ مزین شامیانے، حسین بارہ دریاں اور طرح طرح کے خوبصورت خیمے ہر طرف آراستہ ہو چکے تھے۔ ایک گھما گھمی مچی ہوئی تھی اپنے اپنے طور پر سارے ہی لوگ مشغول تھے۔ رنگین اور چمکیلے لباسوں میں بچوں کی ٹولیاں اپنی اپنی خوشی کے عجیب عجیب مظاہرے کر رہی تھیں ایک طرف کنارے کے شامیانے میں روشن چوکی، مشکی اور انگریزی باجے نغمہ سرائی کر رہے تھے۔ نجمی کو جگہ جگہ سے آنے والی یکبارگی اتنے آدمیوں کی ملی جلی ہوئی آوازیں بڑی اچھی لگیں۔ اس نے دروازے کے بڑے کیواڑ کے پیچھے سے چھپتے ہوئے ذرا اور آگے جھک کر دیکھا۔ مسرت کی لہر بجلی کی ایک رو کی طرح اس کے حساس رگ وپے میں دوڑ گئیں۔ یکایک یہ گھما گھمی یہ ملی جلی ہوئی پُرشور آوازیں اسے گذرے ہوئے دنوں کی یاد دلا رہی تھیں، اس نے کیواڑ سے لگے ہوئے یہ محسوس کیا، جیسے وہ اپنی آنکھیں بند کئے دلہن بنی شہانے کپڑے، زیور عطر اور پھولوں کی خوشبو میں لپٹی ہوئی پرویز کی منتظر ہے۔ اس کی روح کے سب تار نغمہ ریز تھے اور اس کا دل مسرتوں کے ترانے گا رہا تھا۔

وہ اپنے مدتوں کے دیکھے ہوئے خواب کی تعبیر اپنی نگاہوں سے دیکھنے والی تھی۔ تین سال کے طویل عرصے اور خاموشیوں میں اس کی آنکھیں پُرشوق تمناؤں کے خواب دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ اسی لئے اس کی روح اپنے تخیئل کے حسین شہزادے کے ملنے کے خیال سے کپکپا رہی تھی۔ نجمی نے پرویز کو شدید طور پر چاہا تھا۔ اس کی محبت

خاموش پرویز سے جدا ہو کر روحانیت کے اس مقام تک پہنچ گئی تھی جہاں وہ فرشتوں کے سنہرے ریشمی پروں کی سرسراہٹ میں پرویز کے لطیف تصوّر کو صرف دُور ہی سے محسوس کرنا چاہتی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ جب وہ حقیقت سے مجاز کی طرف آئی تب اُس نے جانا کہ وہ خود بھی پرویز کی دنیا کے لئے کیا تھی۔ یہی گھما گھمی، انہی گیتوں کی رسیلی جھنکار، شہنائی کے یہی حسین نغمے، جذبات کی انگڑائیاں لیتی ہوئی کشمکش کے ساتھ اسے کتنے سہانے سپنے دکھائی رہے تھے۔ نزدیک ہی گیت کی ایک تیز جھنکار اُٹھی اور شہنائی زور زور سے بجنے لگی۔ بچوں کا ایک رنگین غول۔ نجمی کو دھکیلتا ہوا، اُچھلتا کودتا داخل ہوا اور اس کے پیچھے درجنوں دائیاں پسینے سے شرابور موٹے موٹے گہنوں سے لدی ہوئی، ہاتھوں میں توڑی ہوئی مہندی کی پتیاں لئے، گاتی بجاتی ہوئی اندر آئیں۔ نجمی کو یک بیک یاد آیا، اسی مہندی کی وہ یہاں پر منتظر تھی مگر وہ یہ بھول گئی تھی کہ اسے کس کا انتظار تھا۔ ابھی نکلنی کیلئے شہنائی مہندی کا یا پانچ سال پہلے گذری ہوئی خمار آگیں، معطر سہاگ کی رات میں اسے اپنے پرویز کا انتظار تھا؟ وہ مہندی کا تھال لئے عجلت میں تیزی سے اپنی ماں کے پاس جاکر کام کے انتظاموں میں لگ گئی۔

گھر میں مہمانوں کا ایک ہجوم تھا۔ اپنے سے اونچے اور نیچے سب ہی لوگوں کو دیکھنا پڑتا۔ گھر کا رکھ رکھاؤ۔ لوگوں کے آرام کا خیال، پھر اپنے خاندان کا بھرم رکھنا اور شادی کے اتنے بڑے ہنگامے سے

نبٹنا۔ وہ تھک کر چُور ہو جاتی۔ نزہت، زریں، یاسمین، روشن اور پروین جب اُسے کاموں میں گھری ہوئی پریشان دیکھتیں تو اپنے ضمیر کو تسکین دینے کی خاطر دم بھر کے لئے ٹھہر کر یہ کہہ دیتیں کہ نجمی آپا اگر نہ ہوتیں تو کیا ہوتا"۔ پھر ریشمی غراروں کی سرسراہٹ اور بنارسی ساریوں کی لہریں مچلتی ہوئی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتیں۔ رنگ و بو کی اس فضا میں بار بار نجمی کا دل چاہتا کہ وہ بھی ان اُڑتی ہوئی تیتریوں کے درمیان کچھ دیر کے لئے محوِ رقص ہو سکتی۔ کبھی کبھی وہ لوگوں کی نگاہوں سے چھپتی ہوئی آکر جیسے ہی اپنے بالوں میں کنگھی لگاتی، یا جھلملاتی ہوئی ساری ابھی اٹھائے ہی ہوتی کہ ذکیہ، رفعت اور کبھی فہمی اسے ڈھونڈتی ہوئی آجاتیں۔ نجمی اماں اور پھوپھی تمہیں دیر سے ڈھونڈھ رہی ہیں۔ وہ بیگم یعقوب آئی ہیں، تم نے خاصدان کہاں رکھوا دیا ہے؟ ایسے ہی وقت میں مہمانوں کے لئے کبھی سوڈے کی ضرورت پڑتی اور کبھی برف منگانے کی۔ نجمی، ذکیہ اور فہمی کی اس تلاش سے جل اٹھتی۔ جھلکتی ہوئی ساریوں میں پاؤڈر، غازے اور لپ اسٹک کو لئے دیئے وہ بھلا خود ہی کیوں اتنی تکلیف گوارا کر لیتیں۔ نجمی اپنی چبھتی ہوئی نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے یہ محسوس کرتی جیسے ذکیہ اور فہمی کے نزدیک ان سے عمر میں چھوٹی اور خوبصورت ہونے پر بھی نجمی کو سنگھار کی ضرورت نہ تھی۔ ساری لڑکیوں کی چہل اسے اتنی ناپسند تھی جتنی کہ ذکیہ، رفعت اور فہمی کی مستقل آرائش، کاموں سے کنارہ کشی اور ان کی ہر وقت کی ہنسی سے اسے چڑ تھی۔

پھر بھی اُسے فہمی، ذکیہ اور رفعت سے محبت تھی۔ دِلی محبت، کاموں سے اُکتائی ہوئی، ان کی کنارہ کشی سے غصہ رہ کر بھی وہ ان سے الگ نہ رہ سکتی تھی۔ بچپن کی معصوم گھڑیوں سے لے کر جوانی کے لہراتے ہوئے دنوں میں بھی اکثر وہ ایک ساتھ ہی رہی تھیں۔ ذکیہ اور فہمی کی شوخ اور چنچل طبیعتوں نے نجمی کے دل میں محبت کی گہرائیوں کو نہ سمجھا۔ ذکیہ سمندر کی مچلتی ہوئی رواں دواں موجوں کی طرح ہمہ گیر تھی جس کا اپنا کوئی ساحل نہ تھا۔ اور جس کے لئے سارے ہی کنارے اپنے تھے۔ فہمی کو خود ہی اس کا احساس تھا کہ فطرت نے اس کی رگوں میں شعلے بھر دئے ہیں جسے کہیں ایک جگہ قرار نہ آتا۔ اور نجمی شاداب پہاڑوں کے سینے میں دھیرے دھیرے سلگ کر دہکتی ہوئی مگر کبھی نہ اُبلنے والی ایک جوالا مکھی تھی۔ محبت کی ٹھوس چٹانوں تلے کبھی کبھی اس کی روح میں زلزلے کے جھٹکے بھی آجاتے تھے۔ شرمائی ہوئی سی نجمی نے اپنی روح پر چھائی ہوئی کیف و سرور کی لذتوں کو پوشیدہ رکھے ہوئے اور اپنی نگاہوں کا راز چھپائے کچھ جانتے اور بے جانتے ہوئے بھی رفعت، فہمی اور ذکیہ کی شادیوں کی مسرتوں میں حصہ لیا تھا۔ اس کے دل میں جذبات کے دھاروں پر پرویز کے نام کی کاغذ کی ناؤ کبھی ڈوبتی اور کبھی اُبھرتی ہوئی ہچکولے کھا رہی تھی۔ ذکیہ، فہمی اور رفعت کی شادیوں کی معطر و شاداب فضا میں نئے دولہا بھائیوں کے لطیف اشاروں سے وہ دل ہی دل میں کبھی پورا نہ ہونے والا ایک دھندلا دھندلا سا خواب دیکھنے لگتی ——

——— وہ آنکھیں بند کئے خواب دیکھتے ہی دیکھتے اس کی تعبیروں سے ہمکنار ہوگئی۔ پھر وہ ذکیہ، فہمی اور رفعت کی طرح تجربہ کار سمجھی جانے لگی۔ اور آج وہ ایک نئی کیفیت ایک جانے ہوئے تجربہ کے ساتھ اپنی چھوٹی بہن نیلی کی شادی میں مصروف تھی۔ اس کو لگتا جیسے زندگی کی اس اہم پگڈنڈی پر وہ انجان نیلی کا ہاتھ پکڑے اسے راستہ دکھاتی ہوئی آگے آگے جارہی تھی۔ مگر بے جانے ہوئے راستے پر نیلی کے پیروں میں لغزش تھی اور اس کے پیر کانپ رہے تھے۔ کبھی کبھی بجّی یہ سوچ کر گھبرا جاتی کہ نیلی کے پاؤں کہیں پھسل نہ پڑیں۔ مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا گھر اور اس پر گرمی کا زمانہ بجلی کے پنکھے بھی ناکافی ہو رہے تھے۔ دلہن کے کمرے میں کنواری لڑکیاں نیلی کا چاروں طرف سے گھیرا ڈالے بیٹھی تھیں۔ معصوم، بھولی اور متحیّر نگاہیں سوالیہ جملہ کی شکل میں نیلی کے چہرہ پر جم کر رہ گئی تھیں۔ بیچاری نیلی تو خود ابھی انہی جیسی تھی۔ ان میں بس اتنا ہی فرق تو تھا کہ لڑکیوں کی متحیّر آنکھیں نیلی میں کچھ پا رہی تھیں، اور کچھ پالینے کی جستجو میں گم تھیں اور نیلی اپنے سے بے خبر، اپنے اردگرد سے بے پرواہ آنکھیں بند کئے ہوئے سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی جیسے سوچتے سوچتے تھک کر وہ بیزار ہو چکی ہو۔ اس کے بھیگے ہوئے بالوں کی لٹیں منتشر ہو رہی تھیں اور وہ پسینہ سے تربتر سر جھکائے خود کو دوسروں کے سپرد کر چکی تھی۔

گھر بھر کی ساری لڑکیاں نیلی کو دلہن بنا کر سجانے لگیں۔

گیتوں کی جھنکار میں تیزی آگئی تھی اور طرح طرح کے باجے اپنے نغموں کو عروج پر پہنچائے ہوئے تھے۔ گھر اور باہر لوگوں کا ایک اُمڈتا ہوا سمندر نظر آرہا تھا۔ "دولھا آرہا ہے" کے ساتھ ایک پُرزور ہماہمی مچ گئی۔ لوگوں کی قطاروں کے بیچ میں پھولوں سے لدی ہوئی چمکتی ہوئی کار، سڑک کے دوُرویہ گیس اور بجلی کی جگمگاتی روشنی کے ساتھ احاطے کے پھاٹک میں داخل ہو رہی تھی۔ آتشبازیاں رہ رہ کر چھوڑی جا رہی تھیں۔ آسمان تارے بلند ہو ہو کر مجمع پر اپنے رنگین پھولوں کی بارش کر رہے تھے۔ مہتابیاں چھوٹ رہی تھیں۔ پھلجھڑی اور انار کے یاسمین پھول لہک لہک کر بکھر رہے تھے۔ بجتے ہوئے بینڈ کی دلفریب آواز، پُر معطّر کار، اور دائیں بائیں قطار در قطار لوگوں کا ہجوم آہستہ آہستہ، جیسے مارچ کرتا ہوا کوئی قلعہ فتح کرنے آرہا تھا۔ سرات اور برات کا ہجوم، دولھا کی موٹر کے ساتھ اندر کے پھاٹک سے لگ کر ٹھہر گیا۔ رنگین، چمکیلے اور جھلملاتے ہوئے کپڑوں میں عورتیں اپنی پُرکیف گیتوں کے ساتھ اندر دروازے میں دولھا کی پیشوائی کے لئے موجود تھیں، ڈھول، بینڈ، باجوں اور گیتوں کے نغمے پھوٹ رہے تھے۔ آتش بازیوں سے رنگینیاں برس رہی تھیں۔ بیلے، جُوہی اور چنبیلی کے پھول برسائے جا رہے تھے۔ نجمی اپنے جھرمٹ سے پیچھے چھوٹ گئی تھی۔ اس کی ساتھی لڑکیاں دولھا کی پذیرائی اور تماشہ دیکھنے کے لئے بہت آگے پہونچ چکی تھیں بھیڑ کو ہٹاتی ہوئی نجمی کچھ آگے تک آئی۔ یکایک مجمع کو چیرتی ہوئی اسکی

نظر پرویز پر پڑی۔ اس کی خوبصورت پیشانی دُور سے چمک رہی تھی۔ مگر وہ کچھ کھویا ہوا سا تھا۔ اس کی نگاہیں اندر صدر دروازے میں کسی مرکز پر جم کر اسے ہمیشہ کے لئے جذب کر لینا چاہ رہی تھیں۔ ایسی مسرور فضا اور خوشبوؤں کے اس امنڈتے ہوئے دریا میں وہ ساری باتوں سے بے خبر سارے ہنگامے سے بے نیاز، اپنے سے نزدیک مگر شاید۔۔ بہت دُور کچھ دیکھ رہا تھا۔ نجمی نے اپنے سے دُور پرویز کی نگاہوں کے مرکز چہکتی ہوئی ذکیہ، رفعت اور فہمی کو دیکھا اور جیسے اس بڑھتے ہوئے طوفان میں اس کا دل ڈوب کر رہ گیا۔ پھر اُسے کچھ نہ معلوم ہوا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس کا دماغ پُر شور ہنگاموں سے اڑا جا رہا تھا، اس کی بے بس نگاہیں پرویز کی تکتی ہوئی آنکھوں پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک ریل پیل مچی، دولہا اندر آ رہا تھا۔ ذکیہ نے جلدی میں نجمی کی چوڑی کو پکڑ کر کھینچا "ارے دیکھ تو کتنا خوبصورت ہے نیلی کا دولہا" یک بیک جیسے برف کا ٹھنڈا پانی پی کر نجمی کو ہوش آیا ہو۔ اس کے دل پر سے ایک بوجھ ہٹتا ہوا محسوس ہوا۔ "پرویز کے حُسن کی ٹکر اب خوب رہیگی" نجمی کی کلائی میں درد کی ایک ٹیس اُٹھی۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ ذکیہ کے کھینچنے سے چوڑی ٹوٹ کر اس کی کلائی میں چُبھ گئی تھی اور نجمی کے گورے گورے ہاتھ پر سُرخ سرخ خون کی دھاریاں اس کی انگلیوں کے سرے پر قطرے بن بن کر زمین پر ٹپک رہی تھیں۔ دولہا اندر آ چکا تھا۔ ٹونے اور جوگ گائے جا رہے تھے۔ یاسمین نزہت اور زریں وغیرہ دولہا کو اپنے گھیرے میں لئے اپنے ریجھانے والے گیتوں سے اسے مسحور کر رہی تھیں۔ ذکیہ کے ہاتھ

میں چاندی کے طشت پر شیشے کے گلاس میں شربت تھا جسے وہ اصرار کر کر کے بار بار دولھا کو پلا رہی تھی۔ اپنی دُکھتی ہوئی کلائی کو پکڑے ہوئے نجمی نے دور سے یہ حسین منظر دیکھا۔ مسرت کی لہر اس کی رگ رگ میں دوڑ گئی۔ فطرت پرویز سے نجمی کا انتقام خود ہی لے رہی تھی۔ وہ اسی طرح اپنی کلائی پکڑے ہوئے صحن میں اُتر گئی۔ روشنی کے ٹھیک سامنے اتنے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر فہمی دور ہی سے چیخی "ارے نجمی اتنا بے حد خون! بس پانی دیتی جاؤ!" "باہر سے انور کو بلاؤں؟ وہ ڈاکٹر ہے ٹھیک سے دیکھے گا" "رہنے بھی دو بس ذرا کس کر پٹی کر دو۔" نجمی مسکرائی۔ اس کا جی چاہا کہ کسی طرح وہ اپنے دل کے رِستے ہوئے ناسور کو دکھا دے۔ جس کو پرویز، ذکیہ رفعت اور فہمی کی نگاہوں نے چھلنی چھلنی کر دیا تھا۔ مگر وہ کچھ بول نہ سکی۔ درد میں ڈوبی ہوئی نگاہیں فہمی کی جھکی ہوئی آنکھوں میں پرویز کی مدہوش کشش کو ڈھونڈھنے لگیں۔ کس کر بندھی ہوئی تہہ بہ تہہ پٹی کے اوپر سے بھی خون کے دھبے اُبھر آئے تھے۔ نجمی بھیڑ کو چیرتی ہوئی مشکلوں سے صحن میں چوکی کے فرش تک آ گئی۔ اُمتی ہوئی گرمی میں پھولوں کی مہک، طرح طرح کے سینٹ کی خوشبو، پسینے، لبساند اور بہت سی ملی جلی ہوئی بُو سے نجمی کا سر چکرانے لگا۔ وہ بڑی دقتوں سے ایک کرسی پر اپنے لئے جگہ بنا سکی۔

جا بجا کیف و نشاط، قہقہے اور رنگینیوں کی لہریں قوس و قزح کی کمانیں بن بن کر ہر سمت سے نگاہوں کو دعوتِ سرور دے رہی تھیں۔ پھر بھی شہانے رنگ کی سُرخ شہابی دہکتی ہوئی رنگینیاں ہر طرف سے نمایاں تھیں۔ چوکی

کے فرش کے اوپر دولہن کی سُرخ مسہری تھی اور اس کے سامنے لال رنگ کے چمکیلے ساٹن پر گوٹے اور چھاپے سے سجے ہوئے غلاف دار صوفے پر نیلی کا دولھا شرمایا ہوا سا خاموش بیٹھا تھا۔ شوق کی بیقراریوں کو زیادہ سے زیادہ بھڑکانے کے لئے دولھا اور دلہن کے درمیان گوٹے اور چھاپے سے آراستہ سُرخ رنگ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ گرمی کی انتہا اور مہمانوں کی اتنی کثرت ہر طرف لوگوں کا اُمڈتا ہوا ایک سیلاب لہرا رہا تھا۔ نجمی کی کلائی میں رہ رہ کر ٹیسیں اُٹھ رہی تھی۔ اور اتنا خون بہنے سے اس کا سر چکرا رہا تھا۔ رسمیں ہوتی رہیں اور آہستہ آہستہ دلہن کے سامنے ڈالا ہوا پردہ ہٹا لیا گیا۔ نگاہوں کے آگے جیسے تڑپتی ہوئی بجلی سی کوند گئی، شہانے کپڑے زیور اور پھولوں سے سجی سجائی ہوئی نیلی آنکھیں بند کئے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ سُرخ جھین کریب کے شہانے ڈوپٹے پر چمکی اور طبق کے چھاپے جگمگا رہے تھے۔ سنہرے سہرے کی تڑپتی ہوئی لڑیوں کا نقاب دلہن کے خوبصورت چہرے پر جھلملا رہا تھا۔ سہرے کی لڑیوں اور سرخ کریب کے دوپٹے سے چھن چھن کے نیلی کے چہرے کا کوئی کوئی حصہ دمک اٹھتا تھا۔ نجمی کو اپنی بہن نیلی پر بڑا پیار آیا۔ اس کے حساس دل میں ایک چوٹ سی لگی اور یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے کہ نیلی اب اس سے جدا ہو رہی ہے اس نے اپنے آنسوؤں کو مشکلوں سے ضبط کرتے ہوئے نیلی سے لگی بیٹھی ہوئی ذکیہ، رفعت اور فہمی کو دیکھا، انہیں دیکھتے ہی اسے پرویز کی مدہوش نگاہیں یاد آگئیں۔ اس نے اپنے کو بہلانا چاہا، وہ دلہن بنی ہوئی

نیلی کو تکنے لگی، ایک دن وہ بھی انہی رنگینیوں میں لپٹی ہوئی تھی نا؟ اس کی بند کی ہوئی آنکھوں میں دنیا کیسی مینا بدوش اور فردوس بداماں تھی۔ اپنے تخیل کے طلسمی شہزادے کو پا کر وہ اپنے کو ایک بلند اور انوکھی فضا میں محسوس کر رہی تھی۔ پرویز کی مخمور نگاہیں اس کا تبسم، اس کی ضیاء اور اس کی زندگی کا لمحہ لمحہ سب ہی کچھ صرف نجمی کا تھا۔ وہ اسے دور اور نزدیک سے گھنٹوں دیکھتی رہتی۔ پرویز نجمی کی اس بیتابانہ محبت کو دیکھتے ہوئے خود بھی اس کے لئے بیتاب تھا۔ پھر بھی نجمی کے دل کو اس کا یقین تھا کہ وہ پرویز کے لائق نہ تھی۔ پرویز جیسے اعلیٰ دماغ بلند خیال انسان کے لئے کوئی اعلے سوسائٹی کی انتہائی خوبصورت لڑکی چاہیئے تھی۔ نجمی نے پرویز کو پا کر اس کی زندگی کے بلند مقاصد پر ظلم کیا تھا۔ نجمی کے ضمیر نے اس کی روح میں ایک تڑپ پیدا کر دی تھی۔ اور وہ اپنے دل کو تسکین دینے کے لئے طرح طرح کی آزمائشوں سے اپنے کو جانچتی مگر کسی طرح اس کے دل کی خلش مٹتی نہ تھی۔ پرویز کی دیوانہ وار محبت کی کرنیں نجمی کی آنکھوں کو اندھا کر چکی تھیں۔ جیسے چلتے چلتے راستے میں کوئی قیمتی چیز پا کے چھپا لے، ٹھیک اسی طرح نجمی پرویز کو حاصل کر کے اسے سب کی نگاہوں سے پوشیدہ اپنے دل سے لگائے رکھنا چاہتی تھی۔ نجمی نے پرویز کو پا کر اپنی ہستی کو بھلا دیا تھا۔ اس کی زندگی کی ایک ایک جنبش پرویز کے مقصد حیات تک بس پہنچ جانے کے لئے تھی۔ وہ اپنے ماحول سے اڑ کر اتنی بلندی پر جانا چاہتی تھی جہاں سے وہ پرویز کے خیال و نگاہ کی رفعتوں سے بہت دور نہ رہ سکے، نجمی

کتابوں پر چھا گئی۔ کچھ سمجھے اور بے سمجھے ہوئے مضامین اپنے دماغ میں بھرتی چلی گئی۔ وہ چھپ چھپ کے مجلسوں پر چھائے ہوئے پرویز کی علمی باتیں سنتی پھر تنہائیوں میں اپنے دماغ کے محدود ڈائرے پر یورپ ایشیا اور دوسرے برّاعظموں کے نقشوں کو پھیلا کر سوچتی۔ وہ بڑے غور سے ایشیا کی باتیں سنتی اور ان سُنی سُنائی باتوں کو واضح طور پر سمجھنے کے لئے گھر کی الماریوں اور رسالوں کے انبار سے مضامین نکال نکال کر پڑھا کرتی، بہت سی باتیں نجمی کی سمجھ میں آگئی تھیں مگر اس کے ساتھ ہی ادب کی بلندیوں، معاشیات کی گہرائیوں اور سیاسیات کے الجھاؤ میں اس کے معصوم خیالات الجھکر رہ جاتے تھے۔ پھر بھی وہ چونکہ فطری طور پر تیز تھی اور اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیتیں موجود تھیں اس کی کوشش رائیگاں نہ گئی، اور جیسے ٹوٹی ہوئی پونجی والا بساطی اپنے تھوڑے سے رنگدار کھلونوں کا سارا سرمایہ گاہکوں کے آگے سجا کر رکھ دیتا ہے اسی طرح علمی اور ادبی باتوں میں اپنے دل کو تسکین دینے کی خاطر نجمی اپنی ادھوری واقفیت کے ساتھ حصہ لیتی۔ وہ کامیاب ہو رہی تھی اور لوگوں کے ساتھ پرویز بھی اسکی ترقیوں کو سراہنے لگا تھا۔ پرچوں میں "ادب لطیف" اور رنگین انشائیوں کی سطروں کے نیچے کبھی کبھی اس کا نام بھی نظر آنے لگا تھا۔

مگر اس کے مسکراتے ہوئے روشن دنوں میں رات کی تاریکیاں چھاتی گئیں۔ نجمی کی دنیائے محبت کا آفتاب پرویز ——، بیماریوں کے سیاہ بادلوں میں گھرتا جا رہا تھا۔ مجبور و بے بس نجمی

ایک طوفان بن کر امنڈتی ہوئی بدلیوں کو ہٹا دینا چاہتی تھی۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔ اپنی مایوس نگاہوں کے سامنے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی خوشیوں کے بنائے ہوئے قلعہ پر بم پھٹتے ہوئے بھی دیکھکر وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔ پرویز موت کے جھولے میں ادھر سے ادھر جھول رہا تھا، اپنی زندگی کی ناکامیوں کا اتنا ہولناک منظر نجمی برداشت نہ کر سکی اس کی دیوانہ وار مضطرب روح موت کے بھیانک فرشتے کے سرد دامن سے چمٹ کر رہ گئی اور پھر وہ اپنے ناتواں کمزور ہاتھوں سے تقدیر کے سخت گیر پنجوں سے اپنے پرویز کی زندگی کا پیالہ چھین کر رہی۔

پرویز کے ساتھ صحت گاہ میں نجمی کو بے تھاہ اور بے سہارا رہنا بھی پسند تھا، اب اس کی زندگی کی کوئی تمنا سوائے اس کے نہ رہی تھی کہ ایک پل کے لئے بھی پرویز کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دے۔ وہاں ملنے کے اوقات مقرر تھے وہ بہت دور رہ کر بھی اپنے کو گھسیٹتی ہوئی لاتی۔ پرویز کے "بڈ" سے لگ کر وہ پرویز کی بجھی ہوئی شمع کی لو کی طرح لمبی لمبی حسین مگر ٹھنڈی کمزور انگلیوں کو دیر دیر تک ہاتھوں میں لئے اس میں اپنے جسم کی گرمی پہنچانے کی ناکام سی کوشش کرتی رہتی۔ جب رسٹ کی گھنٹیاں بجنے لگتیں تو وہ سامنے آم کے باغ میں پرویز کے نظر آتے ہوئے "بڈ" کے سامنے اس سے پھر ملنے کے انتظار میں کسی درخت سے لگ کر بیٹھ جاتی۔ سرسراتی ہوئی چیونٹیوں اور رینگتے ہوئے کیڑے مکوڑوں کو دیکھکر اس کا جی یہی چاہتا کہ وہ کسی طرح ان سے

چھین کر ان کی حیات بھی اپنے پرویز کو پلا دے، وہ خود بھی اپنے رگ رگ سے زندگی کو نچوڑ کر اس پر نچھاور کرنے کو بے چین تھی، باغ میں تنہا بیٹھی ہوئی وہ زمین پر پرویز کا نام لکھتی اور کہیں جگہ جگہ درخت کے تنے پر اپنے سر کے کانٹے سے کھود کھود کر گہرا کبھی نہ مٹنے والا پرویز کا نام اجاگر کرتی، وہ اپنے اس محبوب نام کو مٹتا ہوا نہ دیکھ سکتی تھی آخر اس کی آہ کے شعلے پرویز کے جمتے ہوئے خون میں زندگی کی حرارت پیدا کر سکے، نجمی نے اپنے آنسوؤں سے اس کی حیات کی سوکھتی ہوئی جڑوں کو سینچا، اور پھر اپنی محبت آمیز خوننابہ بار نگاہوں کی جنبشوں سے وہ پرویز کی اُجڑی ہوئی بے رونق تصویر میں سُرخیاں بھرنے لگی۔ وہاں کے لوگ اسے چپ چاپ تنہا باغ مین بیٹھا ہوا دیکھکر ہنستے تھے۔ بچوں کی ٹولیاں پگلی پگلی کہتے ہوئے اسے ڈھیلے مارتیں اور کتے دور ہی سے اسے دیکھکر بھونکنے لگتے تھے مگر نجمی کو کسی چیز کی پرواہ نہ رہی تھی، وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُسے شکست دے چکی تھی۔ پھر جیسے ہر طرف بہار چھا گئی تھی۔ نجمی اور پرویز نے ایسے ویرانے کو گلزار بنا دیا تھا۔ جنگلی جامنوں کے گھنے جھُنڈ اور سکھوا کے جنگلوں مین بچھڑے ہوئے جوڑے ایک دوسرے سے مل کر کوئلوں کی طرح کوکنے لگے تھے۔

مرتے ہوئے پرویز کی زندگی کی بھیک لے کر نجمی جیسے ایک مہم جیت کر واپس آئی۔ اس کی زندگی کا لمحہ لمحہ بس اسی خیال میں بسر ہوتا تھا کہ دنیا بھر کی زندگی اور حیات کی سرجوشیاں وہ کیسے پرویز کی رگوں میں بھر دے۔

پرویز کی زندگی کا دستور العمل اب بدل چکا تھا۔ اُسے زندہ رہنے کے لئے خوشیوں، قہقہے اور مسرتوں کی ضرورت تھی۔ موت کے ہاتھوں اپنی روح کو لرزتے ہوئے دیکھکر وہ حریصانہ طور پر اپنی حیات کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ اسے خود اپنے سے ایک شدید محبت ہو گئی تھی۔ سب کی نظروں میں وہ بیمار ہو کر بے حد عزیز ہو چکا تھا۔ رفعت، نیلی، فہمی، ذکیہ اور نجمی۔ پرویز کی زندگی کا اتنا بڑا حادثہ بھلانیکی خاطر طرح طرح کی دلچسپیوں سے اُسے بہلائے رکھتیں۔ پرویز کے دل میں اُمید کی کرنیں بجھ چکی تھیں۔ اس کا مستقبل تاریکیوں میں لپٹا ہوا غمناک تھا۔ اور وہ اپنے حال کی پُرخلش حسرتوں کے ساتھ دنیا کی رنگینی میں ڈوب کر اپنے کو بس بھلائے رکھنا چاہتا تھا۔ کیف و خمار کے احساسِ لطیف سے کھیلتا ہوا وہ اپنی حیات کی بقا کی خاطر شہد کی مکھیوں کیطرح شگفتہ اور نوشگفتہ سارے ہی رنگین پھولوں کے رسوں کو اپنی نگاہوں میں جذب کر لینے کا آرزومند تھا، اسی طرح دلوں کے ساز پر اس کی روح رقص کرتی رہی اور وہ خود کو فریب دیتا رہا، پرویز اپنی حیات کی تشنگی اور اپنے اضطراب کو بھول جانے کے لئے ہمیشہ اور ہر لمحہ بس یہی اک پُرسرور خواب دیکھتا رہنا چاہتا تھا، اس کی زندگی کا سارا سرمایہ لُٹ چکا تھا اسی لئے وہ بیتابانہ فطرت کا سارا حسن اپنے دامن میں سمیٹ لینے کا متمنی تھا۔ ویسے تو اُسے ساری لڑکیاں ہی عزیز تھیں مگر رفعت ذکیہ اور فہمی کی شوخ نگاہوں کے چھلکتے ہوئے ساغر نے اُسے مدہوش

بنا دیا تھا پھر بھی وہ نجمی کو بھلا نہ سکا تھا مگر نجمی اتنی بلندیوں سے گر کر اتنی بڑی چوٹ کو برداشت نہ کر سکی وہ پرویز کی نگاہوں کے لئے ایک اکیلی سرمایہ بن کر اپنے کو پرویز کی نگاہوں میں اتنا گرا ہوا نہ دیکھ سکتی تھی، اس نے جنگل و بیاباں میں جوگن بن کر اپنے پرویز کی زندگی کی بھیک دوسروں کے کشکول میں ڈالنے کو نہ مانگی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ سلگتی رہی اور اس کی نگاہوں کے آگے قہقہے، نغمے، ترنم اور تبسّم کی درخشاں موجوں میں پرویز ڈوبتا چلا گیا، نجمی اپنی روح میں بپا شدہ اتنا بڑا انقلاب برداشت نہ کر سکی۔ وہ پرویز کی زندگی کی اہمیت کو بھولتی ہوئی اس کی رنگینیوں سے یک بیک ٹکرائی...... پرویز کی زندگی کا سانح اس کے لئے خود ہی اتنا ماتم خیز تھا کہ وہ کسی کے دل کی ٹوٹی ہوئی جھنکار کو نہ سن سکا، پرویز اور نجمی دونوں ٹکرائے، پرویز اپنے لبوں سے فطرت کا لگایا ہوا آبِ حیات کا پیالہ چھینتے ہوئے نہ دیکھ سکتا تھا۔ خوشی اسکی زندگی تھی! اور وہ اپنے کو کسی طور سے بس زندہ رکھنا چاہتا تھا، نجمی پرویز کی زندگی کی بھکارن رہ کر بھی اپنی روح کی موت نہ چاہتی تھی، شکایتیں اور بدگمانیاں بڑھتی گئیں اور غیریت کے فاصلے دلوں میں دوری پیدا کرتے چلے گئے۔ نجمی کو اتنی قربانیوں کے بعد پرویز سے ایسی امید نہ تھی اور پرویز، خوشیوں سے دور رہ کر موت کے کیڑوں کو اپنی زندگی میں لگانا نہ چاہتا تھا۔

ایسی رنگین فضا نجمی کے لئے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے کم نہ تھی

وہ تڑپتی رہی، سسکتی رہی مگر پرویز اسے مکمل واپس نہ مل سکا۔ نجمی نے موت کے ہیبت ناک پنجوں سے تو پرویز کی زندگی کو لڑ کر چھین لیا تھا مگر وہ جھوم جھوم کر چھاتی ہوئی رنگینیوں سے پرویز کو نہ چھین سکی!

نجمی کی لٹی ہوئی زندگی ویران پڑی تھی۔ اس کی پیاسی روح پرویز کی طرف حسرت سے دیکھتی مگر اس کی نگاہیں نجمی کے لئے ایک خشک صحرا بن چکی تھیں۔ قہقہوں کی گونج میں اس کا جی بھی ہنسنے کو چاہتا، شوخ اور چنچل نجمی اپنی تمناؤں کی خاکستر میں ایک بجھتی ہوئی چنگاری بن کر پھر وہی پہلا سا خواب دیکھنے لگی تھی۔

ارے نجمی سو گئیں کیا؟ — رفعت نے نجمی کی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ اور نجمی کو سچ مچ لگا کہ جیسے وہ ایک طویل خواب دیکھتی رہی تھی۔ ہنگامے اور بھی پر رونق ہو گئے تھے اور گیتوں کی جھنکار دور تک فضا میں ٹکرا رہی تھی۔ نجمی کو حیرت تھی کہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر رہ کر اتنی باتیں اسے کیسے یاد آئیں! اس کے دماغ کی پرخلش طاقتوں نے اس کی مضطرب آنکھوں کو بیتی ہوئی زندگی کا ہولناک فلم دکھا کر اس کے دل کے رستے ہوئے زخموں میں نشتر لگا دیا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں، نجمی کی کھوئی ہوئی نگاہیں باری باری ذکیہ، رفعت اور فہمی پر پھسلتی رہیں اور پھر اس کی نظر ذکیہ کے بالوں میں لگے ہوئے گلاب کی زرد زرد نوشگفتہ کلیوں پر جم کر رہ گئی اس کے دل میں ایک جھٹکا سا لگا اور اسے محسوس ہوا جیسے اب اس کا

ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ رفعت اور فہمی کے بالوں میں بھی اسی رنگ کی کلیاں لگی ہوئی تھیں۔ اُسے یقین تھا کہ کلیوں کی یہ انوکھی پسند اور اس کی بندش کی یہ نرالی جدت اس کے اپنے پرویز کے سوا کسی کی نہ تھی۔ زرد رنگ کے گلاب کی نوشگفتہ پرویز کی یہ محبوب کلیاں وہ اُسے کبھی بھلا سکتی تھی۔ انہی کلیوں کے پُر شوق گلدستے پرویز نے کتنی دفعہ نجمی کو محبت سے پیش کئے تھے، اسی لئے انہی منحوس رنگ کی کلیوں کی طرح نجمی بھی کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئی تھی، یک بیک اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا، اس کی سانس لُو کے جھلستے ہوئے جھونکوں کی طرح گرم گرم چلنے لگی گیت ڈھول باجے اور اتنے سارے لوگوں کے ہنگاموں سے اس کے دماغ پر ہتھوڑیاں سی پڑنے لگیں۔ اس کو سارا گھر گھومتا ہوا لگا، نجمی کی رگ رگ میں جیسے آگ کے شرارے لپک اُٹھے، اس کی روح میں ایک زبردست زلزلہ آ گیا تھا جس کے جھٹکے اس کے دل کی رہی سہی اجڑی ہوئی دنیا کو اور بھی منہدم کر گئے۔ اپنے ڈھلکتے ہوئے سر کو اس نے اپنے ہاتھوں سے سہارا دینا چاہا اس کی زخمی کلائی درد کی ٹیس سے تڑپ اُٹھی، بندھا ہوا بینڈیج خون سے تر ہو رہا تھا اور بہتے ہوئے تازہ تازہ خون کی بُو نجمی کی روح میں سرایت کرتی جا رہی تھی، اس کی غمناک نگاہوں کے آگے لال لال دھبے ناچ رہے تھے، یکایک اسے سارا مجمع خون میں ڈوبا ہوا محسوس ہوا، اسے ہر طرف لہو کا جمع ہوا لوتھڑا نظر آ رہا تھا اور بہتے ہوئے خونی شعلے

لہک رہے تھے۔ سُرخ صوفے پر نیلی کا دولھا نجمی کو ایک خون آشام دیوتا کی طرح معلوم ہوا جس کے سامنے سر جھکائے دلہن بنی چھوٹی بہن نیلی صندل سیندور اور پھولوں سے سجے بھینٹ چڑھائے ہوئے بکرے کی طرح لگی۔ شہانے کپڑے، دلہن کی مسہری نیلی اور نیلی کی ساری چیزیں اُسے خون میں تیرتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ سارا مجمع جیسے خون کی سُرخ موجوں میں ڈوب رہا تھا۔ بوکھلائی ہوئی نجمی نے اپنے کو ہوش میں لاتے ہوئے جھنجوڑا، وہ تھرّا اُٹھی، گلاب کی ان زرد کلیوں کے پیمانوں سے خود اس کی اپنی زندگی کی مایوسیاں ٹپک پڑیں۔

دلہن کی رسمیں ختم ہو چکی تھیں۔ جب نیلی کو حجلۂ عروسی میں پہونچا دیا گیا تو کافی رات آچکی تھی، مجمع منتشر ہوتا جا رہا تھا لوگوں کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ نجمی اپنی ناکامیوں کے بوجھ تلے تھک کر چُور ہو رہی تھی۔ وہ دوسری طرف آنگن میں سب سے کنارے فرش پر خاموشی سے آکر لیٹ رہی۔ وہ جی کھول کر رونا چاہ رہی تھی، برآمدے میں بجلی کی تیز روشنی میں روشن، ذکیہ، یاسمین، رفعت اور فہمی کے تھکے ہوئے ہلکے نغمے تیر رہے تھے۔ نجمی اپنی آنکھوں کو بند کئے خود کو ان گیتوں میں بہلا رہی تھی۔ اچانک برآمدے سے پرویز کے قہقہوں کی ہلکی سی گونج آئی، کیف و نغمے اور رنگینیاں فضا میں چھاتی ہوئی اسے محسوس ہو رہی تھیں۔ پرویز کہہ رہا تھا "آج تو ذکیہ تم انار کی کلیوں کی طرح کھل رہی تھیں، سارا دن فہمی اور رفعت مہتابی کی طرح چھوٹتی رہی ہیں

اور یہ بچاری یاسمین، روشن اور نزہت تو بس ابھی پھلجھڑیاں ہیں پھلجھڑیاں" قہقہوں کی گونج میں دُور فرش پر لیٹی ہوئی نجمی کی آنکھوں سے جلتے جلتے آنسو ٹپک پڑے۔ اس نے اپنی لڑکھڑاتی ہوئی بے تھاہ نِگاہوں سے آسمان کو دیکھا۔ دُور خلا میں انارکلی کی سُرخ خونیں پنکھڑیوں کے کفن میں لپٹی ہوئی وہ بے بسی سے اپنے ارمانوں کی چِتا کو لہکتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

انتخاب

اپنی الماری میں رکھا ہوا سب سے عمدہ پوڈر لگا کر اس پر غازہ لگاتے لگاتے سنگار میز کے بڑے شیشے میں آپ ہی آپ مسکراتی ہوئی شہنا آپا بولیں ”مُنّی تجھے بھی پوڈر لگا دوں“۔ ”ہُنہ“ مُنّی حقارت بھری نظروں سے سنگاردان کی طرف دیکھکر بولی۔ ”جائیے نہیں لگاتی میں آپ کا اوڈر پوڈر، پرسوں ہی میں نے ذرا سا جو لگایا تھا تو آپ ہی نے تو اماں سے کہکر کتنی ڈانٹ سُنوائی“۔ وہ منہ چڑھا کر نقل کرتی ہوئی بولی ”نہیں لگایا کرتی ہیں یہ سب کنواری بیٹیاں“ اب جاتی ہوں آپکی امّی سے کہنے کہ شہنا آپا کی تو آج شادی ہو گئی ہے“۔ وہ تن تناتی ہوئی کمرے سے نکلنے ہی لگی تھی کہ شہنا اُسے دوڑ کر پکڑ لائی۔ ”ارے ذرا سن تو مُنّی۔ اب ختم بھی کر اپنا یہ غصہ“۔ وہ بڑے

پیار سے منّی کو لپٹاتے ہوئے بولی: "توبہ - یہ دیکھ تو کیسے ہو رہے ہیں تیرے بال - لا میں خوب عمدہ تیل دیکر تیری اچھی سی چوٹیاں گوندھ دوں۔" شہنا کسی نہ کسی طرح بس سنگار میز کے آئینہ کے سامنے ہی کھڑی رہنا چاہ رہی تھی: "دیکھ منّی، یہ روز پوڈر ہے، یہ صندل، یہ کیوٹی ہے اور یہ کٹی کورا، بتا تو کون سا لے گی؟ ارے ٹنگڑ میرا منہ کیوں دیکھ رہی ہے، سچ بتا پوڈر کا ڈبہ دونگی تجھے ایک دم بھرا ہوا - کیسی اچھی ہے منّی میری پیاری پیاری سی۔" اور منّی حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سنگار دان کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں شہنا آپا کا عزیز سرمایہ جسے وہ کسی کو چھونے بھی نہیں دیتی تھیں آج ایسے ہی بند الماری سے باہر میز پر بکھرا پڑا تھا - منّی کے کندھوں پر پیچھے دو سیاہ لمبی لمبی چوٹیاں لٹکنے لگی تھیں جس میں سرخ رنگ کے ربن کا گچھا پھول کی طرح لٹک رہا تھا - آئینہ میں اس کو اپنا پوڈر اور غازہ لگا ہوا چہرہ بہت خوبصورت لگا - سفید پوڈر اور ہلکے ہلکے سرخ لپ اسٹک کے نیچے ٹھوڑی پر اس کا سیاہ تل نمایاں طور پر چمک رہا تھا: "اور اماں جو بگڑینگی تب آپا؟" دس برس کی منّی ایک ننھے سے بچے کی طرح شہنا کا منہ تکتی ہوئی بڑی حسرت سے بولی: "اُنہہ اماں -؟ مت جانا انکے پاس سمجھی، بس چھپتی ہوئی سیدھی چلی جا ــــ" "کہاں شہنا آپا؟" منی بیتابی سے کہنے لگی: "کہاں:" بتا ہی دوں تجھے؟" شہنا کی مسکراہٹوں میں بجلیاں تڑپ رہی تھیں: "ارے تو، یہ اُلّو کی طرح اتنے سویرے سے کیوں سو جاتی ہے منی؟ جانتی ہے رات کو کون آیا ہے شمّو بھیا کو نہیں دیکھا ہے تو نے؟" "ارے

شمو بھیا آئے ہیں۔" منی خوشی سے مچلتی ہوئی بولی۔ "ہاں تو بس وہیں چلی جا سیدھی شمو بھیا کے پاس" "شمو بھیا کتنے وقت کتنے پیار سے شہنا آپا کے لب پر یہ نام پھسلتا تھا ـــ!" "تو آپا مجھکو اپنا والا دوپٹہ دیدیجئے نا۔" اور منی دوپٹہ اوڑھ کر بھاگنے ہی لگی تھی کہ شہنا نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ "ارے بھاگ ہی چلی۔ ادھر میں نے جو اتنی ساری چیزیں تجھے دی ہیں تو میرا ایک کام بھی نہ کرے گی منی۔ لے اسے اپنے جمپر کے نیچے چھپا لے، ہاں بس ایسے ہی اور یہ دوپٹہ اسے ابھی ایسے ہی لپیٹ لے پھر اپنا ٹھیک کر لینا۔ مگر چپکے سے سیدھی چلی جا، دیکھ شمو بھیا کی گود میں جو تکیہ ہے نا بس اسی کو لے کر اس کے غلاف کے اندر رکھ دینا سمجھی نا؟۔ مگر جب کوئی نہ رہے وہاں پر تب۔ بڑی اچھی ہے منی میری میں اپنی منی کو اور بہت سی چیزیں دوں گی شام کو۔"

نیلے رنگ کا موٹا سا لفافہ اپنے جمپر کے اندر چھپائے دوپٹہ سے لپٹی لپٹائی منی جب کمرے سے نکل کر نیچے جانے لگی تو زینے سے اترتے ہوئے اس کے پیر بری طرح کانپ رہے تھے اور اس کا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایک دفعہ زینے پر سے گرتے گرتے جیسے ہی بچی تھی کہ ٹھیک اسی وقت اپنا گیند اچھالتے ہوئے کمو بھیا اس کے سر پر پہنچ گئے اور منی مارے ڈر کے پسینہ پسینہ ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا جی اتنا گھبرانے لگا جتنا آپا کی الماری میں سے چیزیں چراتے ہوئے بھی نہ گھبراتا تھا۔

"یہ شہنا آپا کی الماری میں سے آج تو نے کیا کیا چرایا ہے منّی چل تو شہنا آپا کے پاس۔" توبہ کمّو بھیا بھی کیسے گنوار ہیں جن کو اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ شمّو بھیا سن لیں گے اور وہ بھی چوری کی بات! کمّو بھیا جب اس کو گھسیٹ کر لے جانے لگے تو اپنے جمپر کے اندر نیلے رنگ کے لفافہ کو وہ بہت مضبوطی سے پکڑے چیخی "شہنا آپا!" اور اُس وقت شہنا آپا اُس کے لئے فرشتۂ رحمت بن کر بولیں: "ارے کمّو اس کو کیوں دق کر رہے ہو چھوڑ دو۔" اور وہ کمّو بھیا سے چھٹتے ہی تیر کی طرح سیدھی شمّو بھیا کے پاس پہونچ گئی۔ اس کا دل شاید زندگی بھر میں پہلی بار اتنے زور سے دھڑک رہا تھا اور وہ بدحواس ہو کر اُن کی کرسی کو پیچھے سے پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ "منّی اب اتنی بڑی ہو گئی ہے تو۔" شمّو بھیا بڑے پیار سے اُس کو اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے بولے: "اور تجھے یہ اتنا دلہن کی طرح کس نے سجا دیا ہے منّی؟ کچھ پڑھتی وڑھتی بھی ہے یا بس یہ دو لمبی لمبی چوٹیاں ہی گوندھنی آتی ہیں۔" منّی شرما گئی۔ اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو گردش دیتے ہوئے بولی: "مجھ کو سب پڑھنا آتا ہے شمّو بھیا انگریزی بھی۔ اور ماسٹر صاحب آتے ہیں۔" "منّی یہ آنکھیں پھرانا تجھے کس نے سکھا دیا ہے؟" شمّو بھیا اس کے غازہ لگے ہوئے گال پر بڑے پیار سے تھپڑ مارتے ہوئے بولے: "اور تیری شہنا آپا کیا کر رہی ہیں۔ جا انہیں بلا لا۔" "وہ آئیں گی آپ کے سامنے!" منّی کھلکھلا کر ہنس پڑی: "لیجئے آپا کو بلا دیا۔" اور وہ تکیے کے غلاف کے اندر نیلے رنگ کا لفافہ رکھ کر بھاگ گئی۔ شہنا

آپا زینے ہی پر اُس کی منتظر تھیں۔ منّی کو آتے ہی اُنہوں نے لپٹا لیا، بہت دیر تک منّی آپا کے دل کی تیز دھک دھک اپنی پیشانی کے پاس محسوس کر رہی تھی۔ وہ جب سے اپنے ماموں جان کے گھر آئی تھی یہ پہلی بار ہی تو شہنا آپا اس سے اتنی محبت کر رہی تھیں۔ نہیں تو اس سے پہلے جہاں جملی اور گملی بھیا کی اس سے لڑائی ہوئی اور آپا جھٹ سے منّی کے خلاف رائے پاس کر دیتیں، کل ہی تو الو کی طرح گول گول دیدوں والے جملی نے امرود چھیننے میں اس کا ہاتھ الگ مروڑ دیا اور ناخن سے ایسی ایسی کھرچیں لگائیں کہ بس خون ہی تو نکل آیا۔ مگر وہ بھی اپنی ضد پر اڑی رہی امرود کو سامنے سڑک پر پھینک دیا پر اس ندیدے جملی کو نہ دیا۔ اُس روز وہ دن بھر آپا کے ساتھ لگی لگی پھرتی رہی۔ شہنا کو بھی ایک جگہ قرار نہ تھا، ابھی اس دریچہ کے پاس ہیں تو پھر اس در سے لگ کر کھڑی ہو گئیں۔ کسی بہانے سے شبو کو پکڑ رہی ہیں تو خواہ مخواہ جھبلو کو چڑایا جا رہا ہے۔ شمو بھیا سے وہ پردہ کرتی تھیں مگر وہ اپنے کمرے کے دریچے پر جان بوجھ کر ایسی انجان بنی بیٹھی رہتیں کہ ٹھیک شمو بھیا ان کو پیچھے سے بیٹھے ہوئے دیکھتے رہتے، وہ اپنے بالوں کی لمبی لمبی چوٹیاں سامنے ڈال کر آنچل کو اپنے سینے پر سے سرکا کے اسے پیچھے پھینک دیتیں اور ہاتھ میں کوئی کتاب لئے بس سامنے شمو بھیا کو دیکھتی جاتی تھیں۔ اماں اور ممانی جان کی باتوں کی آواز جب تک صاف طور پر سنائی دیتی شہنا آپا مزے مزے میں آنکھوں اور لبوں کے اشارے سے شمو بھیا سے نہ جانے کیا کیا باتیں کرتی رہتیں

دوپہر کی گرمی میں سب بے خبر سو رہے تھے۔ شہنا آپا چپکے سے نیچے گئیں اور کمو بھیا کے کمرے میں چھپکے اُن کے دریچے پر بیٹھ گئیں، دریچے کے اس پار شمو بھیا بھی آ گئے تھے، وہ شہنا آپا کا ہاتھ پکڑ کر بہت سی باتیں کرنے لگے اور شہنا آپا کی آواز تو جیسے ایکدم سے بدل گئی تھی۔ سُریلی اور لوچدار جیسے کہیں گیت گائے جا رہے ہوں، وہ آہستہ آہستہ آنکھوں اور لبوں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ جنبش دے کر ذرا رُک رُک کر شمو بھیا سے باتیں کرتی جا رہی تھیں اور بچاری منی کو کمرے کے دروازے پر بس دربانی کا کام ملا تھا — اُس کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں مگر وہ آپا کے پوڈر اور غازے کی لالچ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی ہوئی یہ سوچ رہی تھی کہ اپنے کمرے کے در پر وہ کس کو کھڑا کرے گی — اس کو شہنا آپا کی آنکھوں کی گردش اور لبوں کی تھرتھراہٹ بہت اچھی لگ رہی تھیں، اور بے اختیار اس کا جی چاہ رہا تھا کہ یہی چمک اس کے چہرے کو بھی روشن کر دے۔ شمو بھیا آئے اور گئے بھی اور خود اس کی اماں شہنا آپا کے یہاں سے اپنے گھر واپس آ گئی تھیں مگر بچاری منی کو اپنا کھویا ہوا سکون نہ ملا۔ اس کی خلش بڑھتی ہی گئی۔ شہنا آپا کے یہاں آ جانے سے پہلے وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ بڑے شوق سے پتنگ اُڑا اُڑا کر اکثر پیچ بھی لڑاتی رہتی تھی، اس نے کتنے ہی پتنگ کاٹے بھی تھے اور لٹو نچانے کے بعد خود اس کا دل بھی کتنی مسرتوں کے ساتھ رقص کرنے

لگتا تھا۔ مگر اب تو ان باتوں کو یاد کرتے ہوئے اسے شرم آتی تھی۔

اکیلے گھر میں جب اُس کو پڑھنے سے چھٹی ملتی تھی تو کئی کئی بار وہ اپنا سر کھول کھول کر جھاڑتی۔ اور پھر اُسے طرح طرح سے باندھتی رہتی۔ بال بڑھانے کے کئی نسخے اُس نے یاد کر لئے تھے، اکثر بیر کے پتے پیس پیس کر سر دھوئے جاتے، اور کئی قسم کے اُبٹن دن بھر میں کتنی ہی دفعہ منہ پر رگڑ رگڑ کر دھوتی رہتی تھی۔ آپا کا دیا ہوا تحفہ اُس کے پاس ایک پاؤڈر کا ڈبہ بھی تھا جس کو وہ اپنے بکس میں آنے والے دن کے انتظار میں چھپائے رکھے ہوئے تھی۔ مگر یہ آنے والے دن کہاں سے آئیں گے۔ اس کو اسی کا انتشار تھا۔ وہ گھنٹوں بہت سی صورتوں کو یاد کرتی رہتی مگر اُسے کوئی بھی پسند نہ آتا تھا۔ وہ حسرت بھری ایک لمبی سانس کھینچ کر اپنے دل میں سوچتی "کیسے شمّو بھیا مل گئے شہنا آپا کو"— اس کو ایسی باتیں سوچنا بڑا اچھا لگتا تھا۔ ہر روز اس کے جذبات میں نئی کیفیتیں چھاتی گئیں اور ایک لطیف سی کسک کے ساتھ وہ تیزی سے بڑھنے لگی تھی۔ اس کے ذہن میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی بسا ہی رہتا تھا۔ کبھی وہ مجبوراً ستّا کی بھیا ہی کو ہفتوں اپنے پلنگ پر لیٹی لیٹی یاد کرتی رہتی۔ کیسے ہیں وہ؟— آنکھیں بھی تو اچھی سی ہیں۔ چہرے کی تراش ایسی ہے — پھر اُنکی باتیں— اور انکی ٹائی کا رنگ زیادہ تر بلو ہی رہتا ہے نا؟— اور پھر جب وہ کئی بار بلو رنگ کی ساڑیاں اور دوپٹے رنگ رنگ کر پہن لیتی تو اس کا جی اس بلو رنگ اور ستّا کی بھیا دونوں ہی سے اکتا جاتا

تھا ــــ کبھی کبھی اس کو کملی بھیّا کی سنجیدگی پسند آنے لگتی مگر اس کا دل جلد ہی ان کی خاموشیوں سے گھبرانے لگتا تھا ــــ کتنی ہی یادیں ایسی تھیں جیسے چلتے چلتے وہ دم لینے کو کسی درخت کے سہارے کہیں ٹھہر جائے اور پھر وہ اپنی لامعلوم منزل کی طرف بڑھنے لگتی تھی۔ یک بیک اس کو سوچتے سوچتے شوکت یاد آئے جو امّاں کے دور کے رشتہ دار تھے۔ ٹھیک شمو بھیّا کی طرح، خوبصورت سے، جب وہ امّاں سے ملنے آئے تھے تو مُنّی کو ان کے بائیں رُخسار پر چمکتے ہوئے دونوں سیاہ تل بہت اچھے لگے تھے۔ اور وہ ہنساتے بھی تھے کتنا۔ مُنّی کو اپنی منزل قریب جھلکتی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ اکیلے میں اپنی آواز کی مشق کرتی، شہد جیسی میٹھی لچکتی ہوئی آواز۔ جیسی شہنا آپا شمو بھیا سے نغموں میں باتیں کر رہی تھیں۔ اور وہ اپنے سامنے آئینے میں اپنی آنکھوں کی چمک اور لبوں کی جنبش کو دیکھتی رہتی۔ ایک لطیف سی کپکپاہٹ اس کے جسم میں تیرنے لگی تھی اور عجیب طرح کی سنسناہٹیں ٹھیک اس کے کانوں کے پاس گونجنے لگی تھیں۔ اس کے خواب میں رنگینیاں چھاتی رہی تھیں۔ مگر اس کے خیالات اب بھی ویسے ہی تھے ادھورے کے ادھورے ــــ تحفوں کی تمنائیں تیزی سے بڑھتی گئیں اور نیلے رنگ کے لفافے پر کوئی نام لکھنے کو اس کی انگلیاں کب سے ترس رہی تھیں۔ مگر وہ کس کا نام لکھتی ــــ ایک دن امّاں نے جب شوکت کو خط لکھا تو اس کے ایک کونے پر مُنّی نے بھی اپنا سلام اور

نہ جانے کیا کیا لکھ دیا تھا۔ اور اس خط کو چپکے سے اُسی نے ڈاک میں بھجوا دیا تھا کہ کہیں اماں نہ دیکھ لیں۔ مگر جب شوکت کا خط آیا تو اماں کی لمبی آواز گھر کے نئے رینفورس چھتوں میں گونج اُٹھی ـــ "مُنّی"۔ اور مُنّی نے جب اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں شوکت کا خط لیکر پڑھا تو اس میں صاف لکھا ہوا تھا۔ "تم جو یہ لکھتی ہو کہ میں یہ نہ لکھوں کہ تمہارا خط ملا تو اچھا بھئی تمہارا خط نہیں ملا ہے"۔ "امّاں آپ ہی نے تو منع کیا تھا کہ کہیں خط نہ لکھوں۔ اسی لئے میں نے سلام لکھکر منع کر دیا تھا کہ آپ نہ سُنیں"۔ شوکت کا شوخ خط پڑھکر امّاں مُسکرانے لگیں۔ "بے وقوف اِتّی بڑی ہو گئی مگر عقل نہ آئی"۔ اور وہ جان چھڑا کر سیدھی اپنے کمرے میں بھاگی ـــ "توبہ کیسے ہیں یہ شوکت ـــــ ایکدم سے اُلّو ـــ اُنہہ" ـــ اس کا دل حقارت سے بھر گیا۔ شہنا آپا کی طرح ایک نیلا سا موٹا لفافہ جو اُس نے شوکت کو لکھنے کو سوچا تھا تو کیا ہوتا۔ وہ ضرور امّاں کو بھیجدیتے نہ میرا خط ـــ اس خیال کے آتے ہی اس کا سارا جسم کانپ گیا۔ "بڑے بنتے ہیں بچارے ـــ جیسے ان سے بڑھکر اور کوئی ہے ہی نہیں"۔ اُس کی منزل اب پھر بہت دُور ہو گئی تھی مگر کسی طرح گھسٹتی ہوئی اُسے چلنا ہی تھا آخر ـــــ کبھی کبھی شوکت کے خط کی شوخی اس کو اچھی لگتی مگر کیسی خطرناک تھی یہ شرارت اُن کی ـــــ!

اُس کے سُنسان گھر میں خالہ امّاں اور اُن کی لڑکیوں کے آجانے سے ایک رونق آگئی تھی۔ اَنّو باجی شادی کے بعد پہلی بار

یہاں آ گئی تھیں، روشن بجیا اور نزہت آپا بھی بڑی بڑی سی ہو گئی تھیں لیکن پھر بھی شہناز آپا کا سا حُسن کسی میں بھی نہیں تھا۔ سب کی سب دَبی دَبی سِمٹی سِمٹی ہوئی سی تھیں۔ منّی کو کوئی بھی اچھی نہ لگیں۔ بس یہی ہوا کہ گھر میں ہنگامے کچھ اور زیادہ بڑھ گئے اور خالہ امّاں کی نگاہوں میں تو روشن اور نزہت آپا دونوں کی دونوں مجرم جیسی تھیں، جب بھی خالہ اماں کی تیکھی نگاہیں ان کی طرف اٹھتیں بس وہ سہم جاتیں۔ ہر گھڑی ایک چوکیدار کی طرح وہ اُن دونوں کی نگہبانی کرتی رہتی تھیں اور اب ان کی لپیٹ میں منّی بیچاری بھی آ گئی تھی۔ مگر اسے اُن کی آنکھوں کے غصّے اور آواز کی سختی کی ذرا بھی پروا نہ تھی، اور وہ یہ دکھا دینا چاہتی تھی کہ وہ کسی سے بھی نہیں ڈرتی ہے۔۔۔ بس ڈراتی رہیں اپنی انہی دونوں بیٹیوں کو، خالہ اماں کے آتے ہی جیسے ہر طرف سرگوشیوں کے بادل سے چھا گئے تھے، ہر گھڑی سر جھکائے باتیں ہو رہی ہیں۔ اُنّو باجی اماں اور خالہ اماں کی سرگوشیاں کتنی معنی خیز ہوتی تھیں۔ لاکھ کوشش پر بھی منّی ساری باتیں نہ سُن سکی، بیچ بیچ میں شہناز آپا اور کبھی کبھی شمّو بھیّا۔ تحفہ اور خط کا نام آ جاتا تھا۔۔۔ خالہ اماں کی چوکس نگاہیں بار بار روشن نزہت اور منّی پر پھسلتیں اور پھر وہ اپنی باتوں میں لگ جاتی تھیں۔

اماں کا سُتا اُترا چہرہ اور ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں اور خالہ اماں کی خشمگیں نگاہیں اور چونکتی ہوئی نگہبانی میں منّی کو محسوس ہوتا جیسے گھر کے سارے در و دیوار بھی ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے ہیں۔

"شہنا آپا، شمّو بھیّا۔" اس کو یہ دونوں نام عزیز تھے! اور وہ ان کے خلاف نفرت کا اظہار نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس کو یہ سرگوشیاں بڑی اچھی لگتیں اور کبھی کبھی اس کا جی چاہنے لگتا جیسے کوئی شہنا آپا کی جگہ مُنّی کا نام لیتا — اور اس کے ساتھ۔ وہ سوچ میں پڑ جاتی، اور کس کا نام —؟ بلا سے شوکت ہی کا نام کوئی لے لیتا — وہ خالا اماں کو ستا ستا کر زور زور سے قہقہے لگاتی۔ جھُوم جھُوم کر چلتی اور دوڑ دوڑ کر پھر پتنگ اُڑانے گئی تھی۔ اس طرح وہ اپنی شہنا آپا کا تھوڑا سا بدلہ تو خالہ امّاں سے بک بک کرا کے لے لیتی تھی۔ روشن، نزہت اور اَنّو باجی کو جلا جلا کر وہ شہنا آپا کی باتیں کرتی رہتی۔ "میری آپا کتنی اچھی سی ہیں وہ — اور سب اُنہہ۔ توبہ چھی۔" وہ ہونٹ بچکا کر کہتی — شہنا کا نام سُن کر تینوں بہنیں مسکرانے لگتیں اور مُنّی جل بھُن کر کباب ہو جاتی۔ "میری شہنا آپا کا بیاہ ہوگا شمّو بھیّا سے، کتنے خوبصورت سے ہیں میرے شمّو بھیّا — اُنہہ اَنّو باجی کے دولہا جیسے تو نہیں ہیں، نہ بڈھے سے ڈاڑھی والے جن کو دیکھ کے بس گھِن آئے۔"

اَنّو باجی کے چہرے پر ایک کھسیانہ غصّہ سا آ جاتا۔ روشن اور نزہت آپا نیچی نگاہوں سے بس ایک دوسرے کو دیکھ لیتیں اور مُنّی سب سے الگ تھلگ شہنا آپا کی محبت میں تڑپتی رہتی۔

مُنّی بہت دیر سے چھُپی ہوئی اپنے کمرے میں پلنگ پر بیٹھی تھی، اُس کے گھُٹنے پر کتاب کے اوپر سفید کاغذ دھرا تھا، دوات قریب

ہی اُس کے پاؤں کے پاس رکھی ہوئی تھی اور وہ اپنے ہاتھ میں قلم کو پکڑے ہوئے بہت دیر سے کوئی القاب سوچتے سوچتے تھک گئی تھی۔ ایسے ہی تو کل اَنّو باجی کہیں خط لکھ رہی تھیں۔ شہنا آپا کی طرح خط لکھتے لکھتے وہ بھی دیکھتی جاتی تھیں کہ کہیں کوئی خط تو نہیں دیکھ رہا ہے —— مگر بچاری شہنا آپا اس کو یہ نام کتنا پیارا لگتا تھا۔ اَنّو باجی کی طرح وہ ڈھیٹ تو نہیں تھیں کہ کمرہ کھُلا ہوا ہے سب لوگ آجا رہے ہیں بس اتنا ہی پردہ کہ کوئی پڑھ نہ لے اور اس کو بھی آخر مُنّی نے پڑھ ہی لیا تھا —— کئی بار قلم کو دوات میں ڈال ڈال کر وہ روشنائی سکھا چکی تھی۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا کہ اس سادے کاغذ پر وہ کیا لکھے —— اور ایک نے مانے سے کچھ نہ کچھ لکھنے کو اس کا دل سخت مضطرب ہو رہا تھا۔ شہنا آپا کا خط چپکے سے نہ پڑھ لینے کا اب اسے افسوس ہو رہا تھا۔ اور انّو باجی کی طرح لکھنے کو اس کا جی نہ چاہتا۔ ایسے ہی بیکار بیٹھے سامنے کی دیوار کو تکتے تکتے اس کا جی چڑچڑا سا ہو رہا تھا۔ "توبہ جی۔ اب تک اُسے ایک خط بھی لکھنا نہ آیا"۔ اس خیال کے آتے ہی اُس نے اپنے قلم کو پھر روشنائی ڈبویا اور سر جھُکا کر بڑے انہماک سے لکھنے لگی۔

"ارے بے شرم بیہودہ تیرے ہاتھ میں بھی دوات قلم آگیا"۔ امّاں نے کاغذ جھپٹتے ہوئے کہا۔ اور کاغذ پڑھتے پڑھتے جیسے اُن پر دل کا پُرانا دورہ پڑنا شروع ہو گیا۔ اور وہ زور زور سے

ہانپنے لگیں۔ ”بول یہ خط تو کس کو لکھ رہی تھی ——؟“ انہوں نے اس کی کلائی پکڑ کر پلنگ پر سے کھینچتے ہوئے کہا۔ اور بچاری منّی ابھی یہی انتخاب تو نہ کر سکی تھی پھر وہ کیا بتاتی کہ ”کس کو —!“

تم کس نگری میں بستے ہو؟

میں اپنی عزیز دوست شیاما کی انتہائی علالت کی خبر سُن کر اُس کے آخری دیدار کے لئے بنارس جا رہی تھی۔ راستہ بھر بُرے بُرے خیالات مجھے ستاتے رہے اور میں رات کے سنّاٹے میں بار بار اپنا سر کھڑکی سے باہر نکال کر اپنے دل کو بہلانے کی ناکام کوشش کرتی رہی مگر رات کی تاریکیاں، اُجڑے ہوئے کھیتوں کی عجیب و غریب سنسناہٹ دُور ـــــ چراغوں کی مدھم زرد شعاعیں نہ جانے کیوں میرے دل کو اور زیادہ مضطرب کر رہی تھیں۔ میں نے مایوس ہو کر اپنی آنکھیں اس طرف سے ہٹا لیں۔ دفعتاً آسمان پر ایک تیز روشنی نظر آئی۔ اندھیری رات میں ایک ستارے کا اس طرح ٹوٹ کر کسی نا معلوم جگہ پر جا کر گرنا

کتنا افسوسناک منظر تھا اور اب تو اس روشن شعلے کی خاکستر بھی کہیں خاک کے ذرّوں کی طرح منتشر ہو چکی ہو گی۔

میں ان ہی خیالات میں مستغرق تھی کہ مجھے نیند آنے لگی اور پھر میں سو گئی۔ مگر وحشت زدہ دل کو خواب میں بھی سکون نہ ملا اور عجیب عجیب ڈراؤنے خواب سے منظر یکایک بدل گیا۔ میں نے دیکھا ایک بڑے میدان میں کچھ اونچے نیچے پہاڑوں کے بے ترتیب ٹیلے پڑے ہیں۔ میدان کے ایک طرف ایک چوڑی سی ندی بہہ رہی ہے جسکی موجیں دلکش رنگوں کی تھیں اور ان لہروں کی سطح پر ننھی ننھی مچھلیاں ایکدوسرے کا تعاقب کرتی ہوئی دوڑی جا رہی تھیں۔ یک بیک میری نظر پہاڑ کی طرف گئی۔ دیکھا تو سب سے اونچے ٹیلے پر پروفیسر ورما خاموش بیٹھا اپنی ڈائری میں کچھ لکھ رہا ہے۔ وہ مجھے غمگین نظروں سے دیکھکر چاند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا" اس مضطر بگولے کو دیکھو" میں نے دیکھا چاند ٹکڑے ہو ہو کر چنگاریوں کی شکل میں فضا میں تڑپ تڑپ کر فنا ہو رہا ہے۔ ہوا زوروں سے چل رہی تھی۔ اور اس کے جھکڑوں سے درختوں کے پتے بری طرح گر رہے تھے۔ پروفیسر ورما کا اُداس چہرہ بے چین نظر آنے لگا۔ میں پریشان کھڑی کانپ رہی تھی۔ یکایک پروفیسر ورما کھڑا ہو کر کانپنے لگا۔ وہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا۔ میری محروم قسمت میں انھیں روحوں کی معیت لکھی تھی۔ جو ہمیشہ فراق کا ایک اندوہگیں راگ گاتی ہوئی جدائی کے نامعلوم راستے پر گامزن ہیں۔ وہ کچھ دیر ٹھہر کر بولا" میرا فلسفۂ محبت بھی ہمیشہ یہی رہا کہ محبت کرنے

والی دو پیاری ہستیوں کے درمیان جدائی کے شعلے لرزاں ہوں جن میں ان کا سکون دائمی طور پر تڑپتا رہے۔۔۔ اس لئے کہ جب تک آہ کی گرمیاں دل کی گہرائیوں میں شعلہ ساماں نہ ہوں تو پھر محبت سرد پڑجاتی ہے اور ہاں اسی لئے میں نے اپنی روح کو غم کی آگ میں جلاکر محبت کو لازوال رکھا۔" کچھ سکوت کے بعد وہ آہستہ سے بولا۔" مجھے اور ان لطیف روحوں کو محبت کی آگ میں تڑپانا اور پھر تڑپاکر محبت کرنے کے لئے انھیں زندہ رکھنا بھی شاید محبوب فطرت کا ایک اہم ترین اصول ہے۔" وہ خاموش ہوکر اپنی ڈائری کے اُڑتے ہوئے اوراق دیکھنے لگا۔ آج کی تاریخ کے بعد چند سطریں لکھی تھیں۔ پروفیسر ورما نے جھک کر اپنی ڈائری کو اُٹھایا اور زور سے پڑھنے لگا۔" محبت نام ہے فراق کا اور موت اس جدائی کا ابدی ذریعہ ہے۔"

گاڑی کے ایک تیز جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ اس بھیانک خواب سے میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور میری آنکھیں جلد از جلد اپنی شیاما کو دیکھنے کی آرزومند تھیں۔

بنارس پہنچکر جب میں حیران و پریشان "کیلاش لاج" پہونچی۔ تو وہ در و دیوار پر حسرت طاری تھی۔ موٹر سے اُترتے ہی میں اپنی بیمار شیاما کے کمرے کی طرف دوڑی۔ ابھی تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ شیاما کی چھوٹی بہن شیلا مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے بیتاب ہوکر کہا۔" شیلا نہ رو میری شیاما اچھی ہو جائے گی۔" میری باتوں کو سُنکر

شیلا تڑپ اُٹھی اور سسکتی ہوئی بولی۔ "کون اچھی ہو جائے گی ناہید! آہ میری جی جی تو اب اس دُنیا ہی میں نہیں"۔ شیلا کی باتیں سُن کر میں سکتے میں آ گئی۔ میرا سر چکرانے لگا اور پھر میں بیہوش ہو گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں شیلا کی مسہری پر پڑی ہوں اور شیاما کی بدحواس ماں حسرت بھری آنکھوں سے مجھے گھور رہی ہے۔

۲

شیاما میری کلاس فیلو تھی۔ بی۔ اے کے امتحان میں ہم دونوں نے خوب ایک دوسرے کا مقابلہ کیا تھا مگر جیت شیاما کی رہی۔ وہ اپنے کولج بھر میں فرسٹ آئی تھی۔ بی۔ اے کے بعد ہم نے کالج چھوڑ دیا تھا پھر بھی میری اور شیاما کی دوستی قائم رہی۔ وہ اکثر تھوڑے تھوڑے دنوں کے لئے مجھ سے ملنے چلی آتی اور پھر اپنے مسلسل قہقہوں سے میرے مکان کو اپنے سر پر اُٹھا لیتی۔ شیاما بہت ہی مسخری اور ہنس مُکھ لڑکی تھی کتنی شریر اور چنچل تھی۔ کاش موت کے سیاہ خوفناک پنجوں کو وہ اپنے شریر ہاتھوں سے توڑ سکتی۔

شیاما برابر میرے یہاں آتی اور کبھی کبھی وہ اپنے ساتھ اپنی چھوٹی بہن شیلا کو بھی لاتی۔ شیلا بالکل شیاما کا اُلٹ تھی وہ ایک سیدھی سادی سی خوبصورت نہایت شرمیلی لڑکی تھی۔ اسے دنیا میں صرف

دو چیزیں عزیز تھیں ایک شیاما اور دوسری اس کی کتابیں اس کے سوا اسے دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا۔

بی۔ اے کے بعد شیاما کا خیال تھا کہ وہ ضرور ایم۔ اے کرے گی۔ مگر جب وہ اوائل مارچ میں مجھ سے ملنے آئی تو میں نے دیکھا وہ بہت دُبلی ہوگئی ہے اور اس کی سیاہ موٹی موٹی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں میں نے گھبرا کر اس سے دریافت کیا کہ "شیاما تم ایسی حالت میں کیوں ہو؟" وہ غمگین آواز میں بولی "بہت زیادہ فکر و تردّد انسان کو گھُلا دیتا ہے اور اس پر ایم۔ اے کے امتحان کی تیاری" میں نے اُسے خشمگیں نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "پاگل لڑکی مر جائے گی، صحت کا خیال کر سمجھی!" وہ اسی طرح افسردہ لہجے میں بولی "ناہید! بچارے پروفیسر ورما کی یہ انتہائی خواہش تھی کہ میں ایم۔ اے کر لوں"۔ "آہ۔! غریب پروفیسر" میں اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔ اس روز دن بھر شیاما سُست رہی۔

ایک ہفتہ بعد شیاما چلی گئی۔ پھر میری اور اس کی ایک عرصہ تک ملاقات نہ ہو سکی۔ اسے خط لکھنے کی عادت بالکل نہ تھی اسلئے ایک مدّت تک مجھے اس کی بھی خبر نہ ہو سکی کہ شیاما ان دنوں کہاں اور کیسی ہے۔ شیاما کو گئے ہوئے چار ماہ کا عرصہ ہوا تھا کہ ایک روز شیلا کا خط مجھے ملا اس نے لکھا تھا کہ "جی جی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں کی صلاح سے سب لوگ انھیں سنیاٹوریم لے گئے ہیں۔ دعا کیجئے کہ ایشور میری

جی جی کو جلد اچھا کر دے"۔ یہ خبر میرے لئے انتہائی وحشت خیز تھی۔ بہت دیر تک میرا دماغ کچھ سوچنے سے معذور رہا آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جہاں تک جلد ہو سکے گا میں شیاما سے ملنے جاؤں گی خواہ میرے بی۔ ٹی کے امتحان کی تیاریوں میں خلل ہی کیوں نہ پڑے ایک ہفتہ کے بعد میں سینا ٹوریم پہنچی۔ شیاما سے مل کر مجھے بے اختیار رونا آ گیا مگر میں نے انتہائی ضبط کے ساتھ ان آنسوؤں کو اپنی آنکھوں ہی میں جذب کر لیا۔ شیاما کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے گرنے لگے۔ میں نے اسے بہلانے کی خاطر ادہر ادھر کی باتیں چھیڑ دیں وہ کچھ بہل سی گئی اور پھر اس کی مسخری طبیعت عود کر آئی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا "یہ ایم۔ اے کی تیاری ہے ناہید ارے وہ بوڑھا پروفیسر بہت ہی چین سے اب ہو گا، جس کی میں نے ایک بھونڈی سی تصویر پنسل سے بنا کر اس کے کمرے میں چھوڑ آئی تھی۔ تمہیں یاد ہے؟ وہ کس قدر بگڑا تھا"۔ اتنی سی بات کہتے کہتے شیاما بیدم سی ہو گئی کھانسی کی شدت سے اس کا نازک سا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ تھک کر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "آہ یہ کھانسی بہت تکلیف دہ ہے ناہید!" پھر وہ دیر تک اپنی اس قیدی زندگی کا رونا روتی رہی کہنے لگی۔ کالج کی دلچسپ رنگینیوں کے بعد یہ سینا ٹوریم کی زندگی آہ کچھ نہ پوچھو میرے لئے کتنی تکلیف دہ بات ہے۔ یہاں کھانے پینے، اٹھنے اور بیٹھنے کے وقت معین ہیں۔ وہ بولتی جاتی اور کھانسی کے حملے برابر ہوتے جاتے دیر تک ہم

باتیں کرتے رہے جب رسٹ پریڈ کی گھنٹی بجی تو میں خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی اور دیر تک شیاما کی حالت پر غور کرتی رہی۔

تیسرے دن میں واپس چلی آئی۔ جس وقت میں شیاما سے رخصت ہو رہی تھی اس وقت مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ شیاما کی نازک انگلیوں سے کھیلتے ہوئے میرے آنسو بہتے جا رہے تھے۔ مگر شیاما انتہائی ضبط کئے ہوئے مایوس مسکراہٹ سے مجھے بہلا رہی تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے مجھ سے کہا۔ "پھر کب ملوگی ناہید!" میں نے اسے یقین دلایا کہ "جلد ہی۔" اس نے غمگین مسکراہٹ سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "شاید پھر مجھے نہ دیکھ سکو گی۔" میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "ایسی باتیں کروگی شیاما تو پھر میں کبھی نہ آؤں گی۔" چلتے وقت میں نے اس کی پیشانی کو اپنے ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے کہا۔ "خدا حافظ شیاما۔" اور وارڈ سے اُتر کر چلنے لگی چلتے چلتے میں نے مڑ کر اپنی شیاما کو دیکھا مگر آہ میرا دل ڈوب گیا وہ حسرت بھری نظروں سے مجھے تک رہی تھی اور اس کا رومال بار بار اس کے گرم آنسوؤں کو جذب کر رہا تھا۔

۳

شیاما کی خیریت مجھے برابر ملتی رہی اس کو سینا ٹوریم گئے قریب ایک سال کا عرصہ ہو گیا تھا۔ خبر ملی کہ وہ پہلے سے بہت اچھی ہے۔

حرارت اب نہیں رہتی۔ "اے۔ پی" دیا جا رہا ہے اس کی صحت کی خبر سن کر بڑی مسرت ہوئی بے اختیار دل چاہا کہ اسے دیکھ آؤں۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ میں شیاما سے ملنے گئی تو اس نے اپنے بلند بانگ قہقہے سے مجھے خوش آمدید کہا۔ اسے صحت کی حالت میں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی، اس نے وزن میں بھی کافی ترقی کی تھی اور اس کا نمکین سا نولا چہرہ اور زیادہ بھولا بھالا ہو گیا تھا۔

اسے یہاں آکر بہت فائدہ ہوا تھا۔ مگر اس کی کھانسی بدستور تھی اس دفعہ میں نے شیاما کو بہت ہی شگفتہ پایا۔ اس کی طبیعت یہاں لگنے لگی تھی۔ مگر کھانسی کے ہر ایک دورے کے بعد وہ مضمحل ہو جاتی۔ بیتاب ہو کر کہتی "یہ کھانسی اب میری جان ہی لیکر چھوڑے گی، جانتی ہو ناہید ساری طاقتیں کھانسی کی اس مسلسل زیر و زبر میں پس جاتی ہیں" میں اس کی تکلیف دہ کھانسی سے بیقرار ہو کر کہتی۔ اے کاش میں یہاں نہ آئی ہوتی۔ آہ اس کی موٹی موٹی آنکھیں کیسے حسرت بھرے آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی تھیں۔ اس کا نازک بدن کھانسی کے دورے سے تھک کر چور چور ہو جاتا تھا۔

ایک روز اُسے تھوڑی سی حرارت ہو گئی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی۔ "ڈاکٹر" فرینک ایولشن" کے لئے کہتے ہیں مگر فرینک سے بھی میں سمجھتی ہوں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔" وہ کچھ ٹھہر کر بولی۔ "میں موت سے نہیں ڈرتی ناہید۔ موت تو ایک زینہ ہے اس دیار حبیب میں پہنچانے کا

جہاں جسم سے آزاد میری روح کسی عزیز ہستی سے دائمی طور پر مل کر ہمیشہ مسرور رہے گی۔ ناہید! تمہیں کیا کہ تمہاری شیاما ایک عظیم صدمہ اُٹھا کر بھی کیسے قہقہہ لگا سکتی ہے وہ غمگین آواز میں بول رہی تھی ـــــ "میرا جسم خوش ہو کر جھوم جاتا ہے میں قہقہہ لگا سکتی ہوں۔ دنیا کی نظروں میں شیاما ایک مسرور لڑکی ہے۔ لیکن اس کے قہقہے بلند ہوتے ہی فضا میں آگ لگا دیتے ہیں ـــــ آہ میری مسکراہٹوں میں کتنا سوز ہے۔ میرے ہر ایک تنفس میں کتنے شرارے لرزاں ہیں ـــ؟ اور شیاما کی روح وہ تو ہر وقت غم کی آگ میں تڑپتی رہتی ہے۔ ناہید! تم میری روح کی دیوانہ وار چیخ و پکار کو کیا جانو۔ ہاں کسی رات کی تنہائی میں شیاما کی روح اس کے جسم سے گلے مل کر رونے لگتی ہے تو ان محروم آنکھوں سے بھی آنسوؤں کے چند قطرے نکل پڑتے ہیں ـ" وہ اتنا کہکر رونے لگی اور میں حیران و پریشان اس کی باتوں کو سن کر خاموش تھی۔

دوسرے روز پھر وہ اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگا رہی تھی۔ اس روز اس کو حرارت نہیں تھی اور وہ بحال تھی۔ اسی دن شام کے وقت باغ کی صفائی کرتے ہوئے مالی کی بیٹی پولینا کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ بیچاری ہم لوگوں کے سامنے ہی تڑپ تڑپ کر سرد ہو گئی تھی۔ شیاما کی

آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے وہ پولینا کی لاش کو تکتے ہوئے بولی۔ " ناہید! کیا مرنے کے بعد روح اپنی ایک محبت کرنے والی روح کے ساتھ رہ سکتی ہے؟" وہ افسردہ لہجے میں بولی " ہوسکتا ہے کہ روح قسمت کی نارسائیوں سے آزاد ہو۔" وہ اپنی باتوں کا جواب خود ہی دے کر بولی " مگر کسے خبر کہ روح کی محرومیاں اور زیادہ ہولناک نہ ہوں۔"

ایک ہفتہ کے اندر ہی شیاما کا " فرینک ایولیشن " ہوگیا اور میں اس کی پیٹی کھلنے کے دوسرے روز واپس چلی آئی کیونکہ مجھکو بی۔ ٹی کا امتحان دینا تھا۔

ایک ہفتہ بعد مجھے شیلا کا خط ملا اس نے لکھا تھا کہ شیاما کا "فرینک ایولیشن کچھ کامیاب ثابت نہ ہوا۔ اسے پھر حرارت رہنے لگی ہے اور اب وہ سینیا ٹوریم سے اکتا گئی ہے۔

امتحان کی محنت سے میری طبیعت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ مگر میں نے اس حالت میں بھی شیاما کو دیکھنے جانا چاہا، لیکن ڈاکٹروں نے وہاں جانے سے سختی سے روکا اور میں مجبور ہوگئی۔ صرف شیلا کے خطوط سے شیاما کی خیریت معلوم ہوتی رہتی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد مجھے یہ وحشتناک خبر ملی کہ شیاما اب اپنے مکان پر بنارس میں آگئی ہے اور اس کی حالت

بہت خراب ہے۔ ڈاکٹروں نے مایوسی ظاہر کردی ہے اور یہ کہ میری شیاما میری "منتظر ہے"۔ مجھے یہ خط اس وقت ملا جبکہ میں ۱۰۳ درجہ کے بخار میں پھنک رہی تھی۔ ایک ہفتہ بعد جب میری طبیعت کچھ اچھی ہوئی تو میں بیقراری سے اپنی شیاما سے ملنے آئی۔ مگر کب؟ افسوس جبکہ میری شیاما اپنی اشکبار آنکھوں سے مجھے ڈھونڈتی ہوئی جا چکی تھی۔

۴

میں شیلا کی مسہری پر لیٹی ہوئی سب باتوں کو یاد کر رہی تھی۔ مسہری کے سامنے شیاما کی ہنستی ہوئی تصویر آویزاں تھی۔ میں شیاما کی تصویر کو غور سے تک رہی تھی۔ آہ وہ ہنستا ہوا چہرہ وہ پیاری پیاری آنکھیں اب کیا ہوئیں؟ تصویر دیکھتے دیکھتے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے شیاما مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ دفعتہً مجھے خیال ہوا شیاما کی وہ ادھوری باتیں جو کہتے کہتے وہ رونے لگی تھی یونہی رہ گئیں۔ میں مسہری سے تڑپ کر اپنی شیاما کی تصویر کے پاس پہنچی اور اسے

ہاتھ میں لے کر اپنی اشکبار آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ یکایک میری نظر دوسری تصویر پر گئی اور میں اسے دیکھکر حیران رہ گئی۔ "کون؟ کالج کا مرحوم پروفیسر ورما اور اسکے ساتھ میری شیاما"۔ بجلی کی ایک تیز رو کی طرح گذرے ہوئے واقعات میرے دماغ میں جمع ہونے لگے۔ جب شیاما ایف۔ اے کے آخری سال میں تھی تو لوگوں کا یہ خیال تھا کہ پروفیسر ورما شیاما کی طرف بیتابانہ کھنچا جا رہا ہے۔ میں نے شیاما سے دریافت کیا کہ اصلیت کیا ہے مگر وہ معصومانہ انداز میں خود مجھ ہی سے پوچھنے لگی کہ واقعہ کیا ہے؟

پھر عرصہ تک کوئی بات نہ ہوئی۔ مگر جب شیاما بی۔ اے میں فرسٹ آئی تو لوگوں نے خوب پھبتیاں کہیں۔ لوگوں کے کہنے پر میں نے بھی غور کیا مگر مجھے تو بس اتنا ہی پتہ چلا کہ شیاما بہت ہی اچھی لڑکی ہے اور مسٹر ورما غیر معمولی طور پر اس کا خیال رکھتے ہیں۔

۵

بنارس آنے کے دوسرے دن میں گنگا کی طرف طبیعت بہلانے کیلئے چلی گئی۔ چونکہ مجھے راستے کا صحیح علم نہیں تھا اس وجہ سے میں بھٹکتی ہوئی مرگھٹ کی طرف آنکلی۔ میں آئی تو تھی اپنی طبیعت بہلانے مگر آہ!

شمشان کے ہیبت ناک مناظر نے مجھے بڑی طرح تڑپا دیا۔ کیسا بھیانک منظر، اف کتنی ویرانیاں ان بربادیوں میں آباد تھیں۔ کتنے حسرت و ارمان کی پتھرائی ہوئی آنکھیں ان ذرّوں میں منتشر تھیں اور کتنے دھڑکتے ہوئے بیقرار دل اپنی تمناؤں کے ساتھ خاک کے ان سیاہ ذروں کے ساتھ لپیٹے پڑے تھے۔ شمشان کی جھلسی ہوئی زمین کے گرد بے رونق سوکھی ہوئی گھانسوں سے بکیسانہ لپٹی ہوئی انسانی خاکستریں پڑی تھیں ––؟

"شیاما میری عزیز شیاما" میں چیخ چیخ کر رونے لگی۔ آہ کیا میری شیاما اب ہمیشہ کے لئے مٹا دی گئی۔ شیاما میری اپنی شیاما، میں شام کی ہلکی تاریکیوں میں اپنی شیاما کو پکار رہی تھی۔ میری شیاما کے ذروں کو اپنی آغوش میں لئے دریا افسردہ روانی سے آہستہ آہستہ شمشان کے جھلسے ہوئے ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر بہہ رہا تھا۔ تاریکیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اور شمشان کی ویرانیوں میں اور اضافہ ہو رہا تھا۔ مرگھٹ کے ہیبت ناک منظر سے گھبرا کر میں گھر جانے کو مڑی تو دیکھا دریا کے کنارے اور وحشت برس رہی ہے۔ مشرق کی طرف سے چاند آہستہ آہستہ نکل رہا تھا اور اس کی زرد روشنی میں دریا کی ہلکی ہلکی روانی اور ریت کے ذرّے تھرا رہے تھے۔ درختوں کی شاخیں خاموشی سے جھکی ہوئی تھیں اور ان کے سیاہ سائے ان خاموشیوں میں کانپ رہے تھے دور افق کی تاریکیاں ہیبت ناک بھوتوں کی طرح رقص کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ میں نے گھر چلنے کے لئے دو ہی قدم بڑھائے تھے کہ یکایک میرے کانوں میں

شیاما کی افسردہ آواز سُنائی دی۔ ”ناہید!“ میں نے مڑ کر دیکھا میری شیاما دھوئیں کے رنگ کی ساری میں ملبوس میرے قریب ہی کھڑی تھی۔ میں اسے دیکھتے ہی سر سے پیر تک کانپ گئی۔ شیاما، مری ہوئی شیاما اپنے شمشان میں مجھ سے ملنے کے لئے آئی تھی ـــ مگر آہ، وہ کتنی بیقرار تھی۔ میری ہنستی ہوئی شیاما اب کیسے بدل ڈالی گئی ـــ وہ مجھ سے اور قریب آگئی۔ مجھے غور سے دیکھا اور پھر وہ میرا کانپتا ہوا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے بولی ”میری ناہید“ اس کی شیریں مگر اندوہگیں آواز سُنکر میرا سارا بدن ایک بار تھرا اُٹھا۔ اور مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ مجھے گرتا ہوا دیکھکر شیاما اپنے بازوؤں کا سہارا دیتے ہوئے مجھے اپنی آغوش میں لے کر آہستگی سے بیٹھ گئی۔ میں اس کی گود میں سر رکھے آنکھوں کو بند کئے خاموش پڑی تھی اور میرا دماغ ایک بار پھر انہی خوشبوؤں سے معطر ہو رہا تھا جس کی مستانہ شمیم سے میں ہمیشہ مدہوش رہتی تھی۔

میں اپنی شیاما کی فردوسیں آغوش میں خاموش پڑی تھی لیکن انتہائی ضبط پر بھی میری بیقرار چیخ نکل گئی۔ میں نے شیاما کے آنچل کا کونہ اپنی مٹھی میں بھینچتے ہوئے کہا۔ ”میری شیام مجھے چھوڑ کر اب نہ جانا۔“ اس نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا ”ناہید اب تمہاری شیاما بدل ڈالی گئی ـــ میرا وہ جسم جو دنیا کی انتہائی سختیوں کے بعد تمہیں مسرور نظر آتا تھا موت کے ہاتھوں فنا کر دیا گیا۔ ان قہقہے لگانے والے لبوں کو جلا کر آوارہ ہواؤں کی دوش پر منتشر کر دیا گیا...... مرنے کے بعد

روح جسم کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور ایک نئی روح اسی روحانی جسم سے پیدا ہوتی ہے ۔۔ مگر تمہیں کیا خبر کہ پہلے ہی میری روح کتنی پرسوز تھی اور اس پر ۔۔۔ اس روح کی مزید بیقراریاں ، آہ کچھ نہ پوچھو"

شیاما اپنی بیچین نظروں سے مجھے تکنے لگی ۔ اس کے لب کچھ کہنا چاہتے تھے مگر وہ ایک کشمکش میں تھی ۔ آخر رکتے رکتے وہ بولی ۔ تمہیں کالج کی وہ باتیں یاد ہیں جو لوگ کہتے تھے کہ پروفیسر ورما میرا پرستار ہے ، وہ باتیں سچ تھیں نا بید۔۔۔! پروفیسر انتہائی گرمجوشیوں سے محبت کر رہا تھا اور میں اس سے گریز کر رہی تھی ۔ وہ مجھے کھنچتا ہوا دیکھکر پروانے کی طرح مجھ پر نثار ہو رہا تھا اور میں شمع کی طرح بے پروا خاموش تھی ۔ جب میں دیکھتی کہ پروفیسر کی نگاہیں میرا تعاقب کر رہی ہیں ۔ تو میرا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگتا ۔۔۔ اور آخر میں پروفیسر کی محبت کی آگ سے محفوظ نہ رہ سکی ۔ مگر جیسے جیسے میرے دل میں محبت کی چنگاری سی شعلہ بن رہی تھی ۔۔۔ پروفیسر مجھ سے دور رہنے لگا تھا ۔ میں اکثر ورما سے ملنے کے لئے جاتی ۔ وہ مجھے دور سے آتا دیکھکر ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہتا مگر جب میں اس کے قریب پہنچ جاتی تو وہ گھبرا کر کمرے سے باہر چلا جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر مایوس ہو کر میں واپس چلی آتی ۔

پروفیسر کی اس عجیب حرکت پر میں حیران تھی ۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ مجھ سے اب نفرت کر رہا ہے یا محبت ۔ جب میں اس سے دُور

رہنا چاہتی تھی تو وہ مضطربانہ میرے گرد چکر لگاتا اور اب جبکہ اسے یقین ہو چکا تھا کہ میں بے تابانہ اس کی قربت چاہتی ہوں تو وہ مجھ سے بھاگ رہا تھا۔

ایک روز ٹینس میں وہ میرا شریک بنایا گیا۔ میں خوش تھی مگر جیسے ہی اسے خبر ہوئی کہ میں اس کی ساتھی ہوں تو وہ بینچ پر بیٹھتے ہوئے بولا" آج میں کھیلنا نہیں چاہتا"

ایک روز میں اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کے پاس گئی۔ اس روز وہ مجھے اپنے قریب دیکھ کر بھاگا نہیں۔ میں سخت پریشان تھی۔۔۔۔۔ اور میری آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس دن پہلی بار اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

عزیز شیاما! سچی محبت کی تڑپ جدائی چاہتی ہے اور میں اس فراق کے تند جھونکوں میں پُرالم سانسیں لے رہا ہوں مگر تم میری شیاما محبت میں قربت کی خواہشمند ہو؟"

وہ کچھ ٹھہر کر بولی ــــ "تم پروفیسر ورما کا فلسفۂ محبت تو جانتی ہو؟ وہ سچ کہتا تھا ناہید، کہ" محبت فراق ہے۔۔۔ اور فراق محبت"

جیسے ہی شیاما کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے مجھے وہ میرا خواب یاد آگیا اور پروفیسر کی ڈائری کے یہ سطور میرے کانوں میں گونجنے لگے کہ" محبت نام ہے فراق کا اور موت اس جدائی کا ایک

ابدی ذریعہ ہے۔

بی۔اے کے دوسرے سال جب میں پروفیسر سے ملنے کے لئے آئی تو یہ سن کر بیچین ہوگئی کہ وہ بیمار پڑا ہے اور اسکی زندگی کی کوئی امید نہیں۔ میں پریشان حال اس کے پاس پہنچی ——— دیکھا تو وہ سچ مچ بہت بیمار تھا۔ میں اس کے سوکھے ہوئے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ لیکن اس نے اپنی نحیف آواز میں مجھے اپنے سے دور رہنے کو کہا۔ وہ پُرنم آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ——— "ٹی۔ بی کے مریضوں سے دُوری چاہیئے شیاما اور پھر اس حالت میں جبکہ وہ چند دنوں کا مہمان ہو۔"

اس نے مجھے لاکھ "ٹالنا چاہا مگر میں نے صاف کہہ دیا کہ میں موت سے نہیں ڈرتی۔ میری جان سے زیادہ تم عزیز ہو، اور اب میں خوش ہوں کہ میں نے اس کا ساتھ دیا۔" وہ آہستہ سے اٹھی اور غمگین آواز میں بولی " زندگی بھر تمہاری شیاما بیچین رہی اب مرنے کے بعد بھی اس کی روح کو سکون نہ ملا۔ اور میرا ورما۔ آہ، ناہید وہ مجھ سے اب تک نہ ملا۔" وہ مجھے حسرت بھری نظروں سے تکتے ہوئے بولی۔" وہ کہاں ہے ناہید! میرا ورما کہاں ہے؟"

شیاما نے اپنے ہاتھ کے ایک ہلکے سے جھٹکے سے اپنی ساری کا کونہ میری مٹھی سے چھڑالیا اور غمناک سروں میں گاتی ہوئی چلی گئی۔ بہت دیر تک اس کی دردناک مدھم آواز افق میں

ڈوبتی ہوئی سُنائی دے رہی تھی۔

میں کھوجت کھوجت ہار گئی
تم کِس نگری میں بستے ہو؟"

آنکھ مچولی

آنکھ مچولی

وہ بچپن ہی سے بہت شوخ و چنچل اور بڑی ہنس مکھ تھی، دیکھنے والے اسے دیکھ کر کہتے ”ہنستے ہی ہنستے تو گھر لیتے ہیں“ اور جب اس کی زندگی کا دوسرا اور سب سے اہم دور شروع ہوا تو اس کے تبسم اور زیادہ رنگین ہو گئے اور ہنسی کی شریلی جھنکاریں ستاروں کی طرح تابناک ہو گئیں۔ اسے تنہائی سے وحشت ہوتی تھی اسی لئے وہ رنگ و بو کی طرح ہر محفل پر چھائی رہتی۔ اس سجی سجائی کوٹھی سے ہر گھڑی قہقہے بلند ہوتے رہتے تھے۔ اور احاطے میں سائیکلوں کی قطاریں لگ جاتیں لیکن وقت اور بے وقت بھرے بھرے رکشوں اور آتے ہوئے موٹروں سے وہ

اکتا گئی تھی ۔ ایک ہی طرح کے ہنگاموں سے اب اس کا جی گھبرا گیا تھا۔ دن اور رات کے اکثر حصوں میں لوگوں کی طرح طرح کی ٹولیاں اس کے یہاں آتیں۔ کچھ اس کے بھائی کے دوست آتے جن کے آتے ہی ڈرائنگ روم کے پردے کھنچ جاتے، برج کا دور چلنے لگتا۔ مونوپلی اور کیرم کے کھیل کھیلے جاتے۔ پھر اس کے دیور اور دوسرے بھائی کے ساتھی آتے ۔ موٹی موٹی لال پیلی جلدوں کی کتابیں دبائے، کبھی تو ان کے آتے ہی کمرے بند ہوکر پڑھائی شروع ہوجاتی اور کبھی وہ بلے اور گیند لئے ٹینس لان پر اچھلنے لگتے ۔ اور ہر روز شام ہوتے ہی گیارہ بجے رات تک اس کے شوہر فیض کے ملنے والے آتے رہتے ۔ ڈرائنگ روم برآمدہ اور کبھی سامنے کا احاطہ کرسیوں سے بھر جاتا۔ پھر تو شاعری اور فن شاعری کے جام چھلکتے۔ اور ادب کی باریکیاں بیان ہوتیں۔ فیض کا ذوقِ ادب بہت بلند اور اس کا مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ وہ ایک کامیاب ادیب تھا جس کے افسانے، ڈرامے، تنقید اور نظموں میں زندگی کی جاگتی ہوئی لہریں رواں اور دواں رہتی تھیں، کبھی زندگی کے اہم اصول اور دنیا کے نظام پر نگاہیں دوڑائی جاتیں، گہرے اور دقیق مسئلوں اور ان کی باریکیوں پر تبصرے ہوتے ۔ قہقہے گونجتے، ہنسی کی لہریں اٹھتیں ۔ اس کی کوٹھی میں زندگی لہراتی رہتی مگر یہ سب کے ہوتے ہوئے بھی وہ گھر کے اندر اپنے کو ایک بے تھاہ وسیع

خلا میں تنہا محسوس کرتی۔ ایک عرصہ تک انہی قہقہوں اور ہنسی کی انہی موجوں میں اپنے کو فریب دیتی رہی تھی، دیر دیر تک پردے کے پیچھے کمرے کے دریچے پر بیٹھی ان کی باتیں سنتی، ان کے تماشے دیکھتی اور بیل کے شربت، انڈے کے حلوے، ناشتے، اور چائے سے ان کی خاطریں کرتی رہتی تھی، پس پردہ اس نے ان رنگینیوں میں اپنے کو بہلانا چاہا تھا مگر اب اسے اس گھر سے وحشت ہونے لگی تھی، یہ اس کا گھر نہیں تھا۔ زندگی کی شاہراہ پر ایک پُررونق کلب تھا اور اس کا جی چاہتا کہ اس کا اپنا بھی کوئی ایک گھر ہوتا۔ بارہ سال کا ایک طویل عرصہ وہ اس کلب میں گذار کر اب تھک گئی تھی، تاش کے پتے اکیرم کی کھٹا کھٹ اور مونوپلی کی ہار جیت میں وہ اپنی زندگی کی شکست ہی دیکھ رہی تھی، بلے اور گیند کی ہر ایک ضرب نے اس کے دل کو مجروح کر دیا تھا اور ادب، دنیا، اور نظام حیات کے گہرے گہرے تبصروں نے اس کی زندگی کے ہر تار و پود کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بکھیر دیا تھا۔ گھر میں اتنے ہنگاموں کے ہوتے ہوئے بھی وہ خود ایک اُجاڑ ویرانہ میں ایک اکیلی ٹھنٹھ درخت تھی۔ اپنی سجی ہوئی کوٹھی سے اب اس کا جی بیزار ہو چکا تھا، سارے گھر بھر اور ڈرائنگ روم کی حسین آرائش سے وہ اکتا گئی تھی، اپنی تنہائیوں سے پریشان ہو کر وہ دن بھر میں کتنی کتنی دفعہ اپنے ہاتھوں سے گھر کی ایک ایک چیز جھاڑتی رہی تھی، مگر ان ساری چیزوں سے اب

اس کا دل بھر گیا تھا، ایک مدت سے ان لٹکتی ہوئی تصویروں کو دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ آتش دان پر رکھے ہوئے خوبصورت کھلونوں پر مہین مہین گرد دیکھکر بھی اب وہ بے پرواہ رہتی۔ کارنس پر سجائی ہوئی گڑیاں بارہ سال سے بس ایک ہی طرح سے بے حس پڑی تھیں رنگ برنگ کی کچکڑے اور مٹی کی گڑیاں، جنکے کپڑے نمک کی طرح گل کر اب پھٹتے جا رہے تھے اور ان کے چہرے پر جگہ جگہ سے خراشیں پڑ گئی تھیں مگر وہ بے حس و حرکت تھکے ہوئے انداز میں بارہ سال کی طویل مدت سے مسکرائے جا رہی تھیں۔ اس کو محسوس ہوتا جیسے وہ خود بھی مٹی یا کچکڑے کی ایک بے جان گڑیا ہے، اس پر بھی ایک جگ بیت گیا تھا اور وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی سرک نہ سکی تھی۔ اس کی روح کی دھجیاں بھی تار تار ہو چکی تھیں، اور مٹی کی گڑیوں کے چہرے سے کہیں زیادہ کھرچنیں اس کے دل پر پڑ گئی تھیں۔ انہی کی طرح اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ وہی مردنی سی بے حس مسکراہٹ، اب تک وہ انجان طور پر ایک بچہ کی طرح ان کھلونوں سے کھیلتی رہی تھی، نقلی کھلونے، اور مٹی کی بے جاں گڑیوں سے۔۔ مگر یک بیک اتنے دنوں کے بعد اب اس کا جی بے اختیار یہ چاہنے لگا تھا کہ کمرے کے ان ریشمی پردوں سے لپٹ لپٹ کر کوئی جھولتا رہے، اس کی روح کو ایک طوفان کا انتظار تھا اور وہ اس آندھی میں گھر کی ایک

ایک چیز کو تتر بتر دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا جی چاہتا کہ کوئی لمبا بانس لئے ان چمکتی ہوئی ساری نفیس تصویروں کو گرا کر چکنا چور کر دے اور اس کا منہ چڑاتی ان مسکراتی ہوئی بے حس گڑیوں کو توڑ توڑ کر کوئی اس کی نگاہوں سے انھیں دور کر دیتا۔ وہ چاہتی تھی کہ میز اور کرسیاں اوندھی رہتیں اور سنگاردان کے شیشے پر بڑے بڑے دھبے پڑے رہتے، اس صاف ستھری اور جھلملاتی ہوئی کوٹھی سے اب اس کا جی اکتا گیا تھا۔ وہ کوئی تبدیلی چاہتی تھی۔ ایسی اہم تبدیلی جو گھر کے کونے کونے پر چھا جائے۔ لمبے بانسوں میں ریڈیو کے ایریل دیکھتے ہی بیتابانہ اس کا دل چاہتا کہ گھر کے ایک ایک حصے میں وہ رسی کی کھدّی سی کھدری الگنی ٹانگ کر ان پر ننھے ننھے بیشمار کپڑے پھیلا دے عجیب عجیب طرح سے بے ہنگم کپڑے جو کبھی اس گھر میں استعمال نہ ہوئے تھے۔ سب سے زیادہ اس کو اپنی بیکاری کھلتی رہتی۔ سارا کا سارا دن پڑا رہتا۔ وہ کتابیں پڑھتے پڑھتے تھک جاتی۔ ایک ہی طرح سے آخر کتنی دیر وہ لکھتی رہتی۔ لکھی ہوئی سطریں جب اس کی نگاہوں کے سامنے ناچنے لگتیں تب وہ اٹھکر اکیلی کوٹھی میں بے مقصد چکر لگاتی، باورچی خانہ کے در پر کھڑی نوکروں کی باتیں سنتی، ڈاکیہ کی آواز سنتے ہی وہ خود ہی ڈاک لینے چلی جاتی۔ ترکاری والی دھوبن اور دودھ والیوں سے وہ خواہ مخواہ کی مہمل باتیں دیر دیر تک کرتی رہتی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی خودداری کو ٹھیس

لگتی اور وہ تلملا کر رہ جاتی۔ ایسی باتیں اس کی شان کے خلاف تھیں۔ پھر وہ کیا کرتی کچھ وقت تو جیسے تیسے کر کے گذر جاتا تھا۔ مگر آخر کب تک ایک ہی شاہراہ پر کھڑی وہ اپنے کو فریب دے سکتی تھی ـــ!

اس کی کوٹھی سے لگی ہوئی دوسری کوٹھی میں گھوش بابو تھے خوبصورت نازک سے، خوش نظر اور خوش سلیقہ، ان کی کوٹھی اور احاطے کا ہر ہر کونا گلزار جنت بنا رہتا۔ انھیں پھولوں سے فطری طور پر ایک مجنونانہ عشق تھا، وہ خود بھی اسی شاخ کے ایک شگفتہ سے پھول نظر آتے اور ان کی بیوی اس گلدستے کے سارے پھولوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور حسین پھول تھیں، وہ سچ مچ میں ایک گلدستہ جیسے لگتے۔ شگفتہ خوبصورت رنگین اور خاموش ـــ ایک گہرا سکون ان کی کوٹھی پر ہر وقت چھایا رہتا، مگر جب سے ننھا گلاب ان کے درمیان آ گیا تھا تب سے ان کے گھر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی، دبلا پتلا حسین سا بچہ جب غوں غاں کے بعد اپنے کمرے کے دریچہ پر کھڑا ہوکر "ماں، ماں" کہکر شور مچانے لگا تو ایک دن پروین اپنے دریچہ سے پکار کر بولی "گلاب! ماں نہیں امی بولو امی ـــ اور یہ اس کا گلاب نام بھی اسی نے رکھا تھا۔ ننھی ننھی انگلیوں سے دریچہ کے جنگلے کو پکڑے دو ایک روز تک تو چپ چاپ وہ پروین کی "امی امی" کہتی ہوئی آواز کو سنتا رہا اس کے بعد سے دریچہ کے سفید پردے کے اوپر سے اچک اچک کر چیخنے لگا "امی! امی!" پہلے تو پروین نے سمجھا کہ گلاب اپنا سبق یاد کر رہا ہے مگر جس دن اس نے یہ محسوس کیا کہ سارا سارا دن اور کبھی رات

کو بھی امی امی کہکر وہ خود اسے پکارنے لگا ہے تو ایک عجیب سی تڑپ اسکے دل میں پیدا ہوئی۔ "امی۔ امی" یہی پیاری سی آواز سننے کی وہ کتنے دنوں سے منتظر تھی۔۔ اس سے پہلے بھی کئی دفعہ اس کی روح میں پرخلش انگڑائیاں آچکی تھیں مگر اس آواز نے اسے ہولناک طور پر بیدار کر دیا تھا۔ یاقوت کیطرح سُرخ لب اور پھٹی پھٹی سیاہ آنکھوں والا حسین سا بچہ جب اس سے لپٹ لپٹ کر کہتا "امی" ۔۔ تو وہ اکیلے میں اس کے سفید گالوں پر اپنے بھیگے ہوئے رخسار رکھکر کہتی۔۔ "میرا گلاب۔ میرا گلاب:" وہ اس کے سارے گھر بھر میں ایک تیتری کی طرح دوڑتا رہتا۔ اور جب گھوش بابو کی بیوی گلاب کو پروین کے پاس رکھکر گھوش بابو کے ساتھ کسی اچھی سی انگریزی فلم دیکھنے چلی جاتیں تو پروین تھوڑی دیر کے لئے یہ بھول جاتی تھی کہ گلاب کس کا بچہ تھا۔! اسی گلاب اور گلاب کی مسلسل پکاروں نے اس کی روح میں ایک خلفشار مچا دیا تھا۔!

یک بیک بارہ سال کی طویل مدت کے بعد پروین نے اپنے میں ایک مبہم سی تبدیلی محسوس کی اور یکایک اس کا دل نئی نئی کیفیتوں سے ہم آہنگ ہونے لگا، رستے ہوئے جذبات نے ایک دھارے کی طرح اس کی رگ رگ میں ہل چل مچا دی تھی۔ اور وہ اپنے خوابِ خیال کے حسین تصوّرات میں کھوئی ہوئی سی رہنے لگی۔۔ امّی ۔۔ امّی" کہتا ہوا گلاب جب اس کی گود میں آنے کو مچلنے لگتا تو وہ اسے آہستہ سے تھپتھپا کر بہلا دیتی"۔۔

”گلاب! تم گلاب ہو نا؟ اور تمہیں ایک ننھا چمیلی کا پھول دوں گی لو گے نا؟“ ــــــ پھر اس کی نگاہیں چنبیلی کے اس حسین سے پھول کے تصوّر پر جم جاتیں۔ نازک خوبصورت ننھا سا چہرہ۔ بڑی بڑی معصوم سی آنکھیں، سر پر اسی کی طرح گھنگریالے بال، چھوٹی چھوٹی انگلیوں والا مہندی لگا ہوا سا پاؤں کبھی ہنستا کبھی بلکتا ہوا پھول کی پنکھڑیوں جیسا یاقوتی ہونٹ“ــ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ کیسے ہو رہا تھا۔ وہ ایک آرٹ کی تخلیق کر رہی تھی۔ اور اسے خود ہی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا شاہکار بنا رہی ہے

فیض نے جب یہ خبر سنی تو مسرّت سے وہ جھوم گیا۔ پھر اس کی بڑی خاطریں ہونے لگیں اس کے سونے کے کمرے میں سُرخ سُرخ شاداب امریکن سیب خوش رنگ نارنگیاں اور بلور کی طرح چمکتے ہوئے دانوں والے انگور کے خوشے رکھے جانے لگے۔ فیض حسن کا پرستار اور شعر و ادب کا ایک کامیاب آرٹسٹ تھا، اسی لئے وہ چاہتا تھا کہ نیند سے بیدار ہوتی پروین کی نگاہوں کا پہلا ٹھہراؤ حسین اور لطیف ہو اور انہی رنگینیوں اور شادابیوں کی آمیزش وہ پروین کے اس آرٹ میں دیکھنا چاہتا تھا ــ!

پروین اپنے دل و دماغ پر چھائے ہوئے کیف و سرور سے گھبرا کر کبھی کبھی سوچتی کہ دنیا کی اس پرانی روایت کو وہ اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہے۔ ایک ایک گلی میں کتنے کتنے بچے

بڑے ہوئے ننھے پیسے میں دو دو ملنے والی گڑ کی مٹھائی اور رینگتے بلبلاتے ہوئے بچوں کی اس دنیا میں کوئی کمی نہ تھی۔ اور ایک ہی وقت میں ان دونوں پر کتنی مکھیاں بھنکتی رہتی تھیں۔ — شاید خود عرصہ ہی انتظار طویل ہو کر اپنی قدر کرانے لگتا ہے، اور اگر یہ بارہ سال کا ایک جگ نہ بیت جاتا تو چنبیلی کا نازک سا پھول اس کے لئے اتنا خوشبودار نہ ہوتا۔ اسی لئے بیچارہ گلاب چھوٹے چھوٹے سے قصور پر بھی اکثر پٹ جایا کرتا تھا۔ پھول کی ایک کلی اور ایک کاٹے سے بیگن توڑ لینے کے جرم میں گھوش بابو نے اسے کئی دفعہ مارا تھا۔ گلاب کے لئے صرف پردین کی ایک اکیلی گود ہی پر سکون تھی وہ اپنی سزاؤں کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ کسی قصور پر بلا کہے سنے بھی اپنے ہاتھوں سے دونوں کان پکڑے وہ اپنے مخصوص کونہ میں کھڑا ہو جاتا۔ مگر جب اس کو اکیلے کمرے میں بند ہونے کی سزا دی جاتی تو وہ دریچے پر چڑھ کر زور زور سے پکارتا — "امی! امی؟" اور پردین اپنے سارے کام کو چھوڑ کر اپنے کمرے کے دریچے سے لگ کر گلاب کے سامنے کھڑی ہو جاتی — پھر گلاب اپنی زبان میں شکایت شروع کر دیتا — "امی! امی! بھگو ماں۔ بن بن۔" یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی پردین کو ایک لطیف انتظار تھا۔ وہ لیٹی لیٹی سوچتی رہتی اور بہت سے خوبصورت نازک نازک سے معصوم بچے اس کے پاس چکر لگاتے۔ کبھی نزدیک اور

کبھی اس سے بہت دور — اس کے گرد منڈلاتے ہوئے ننھے ننھے سے کلبلاتے ہوئے بچے کبھی کبھی اس کی روح سے سرگوشیاں کرتے "چنا پنی پھو"۔ اسے ٹیگور کی کہانی یاد آکر دکھلا دیتی پھر اسے لگتا جیسے بارہ سال سے چھپے ہوئے اسکے بہت سے پھول جیسے بچے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اب اس سے بہت قریب آ رہے تھے "امی تا"۔ اسے گھر کے کونے کونے سے یہی آواز آتی ہوئی محسوس ہوتی — "امی تا" — "امی تا" — لیکن اس آواز کے ساتھ اس کو افسانہ کی وہ بچی یاد آجاتی جسے "تالوسانہ" آتا تھا اور وہ الماری، شلف اور کواڑوں کے پیچھے چھپ چھپ کر اپنی ماں سے بس یہی ایک کھیل کھیلا کرتی "امی چیکو" — "امی چیکو" اور اس کی ماں جان بوجھ کر اسے ڈھونڈتی پھرتی، مگر اس بچی کی آیا اس منحوس کھیل کھیلنے سے ان کو اکثر منع کرتی تھی اور آخر ایک دن بخار میں سر کو دھنتی "امی چیکو"۔ "امی چیکو" کہتی ہوئی وہ بچی اپنی ماں کی ڈھونڈتی ہوئی نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے چھپ گئی تھی۔ اور اب یہی تکلیف دہ آواز پروین کو سنائی دے رہی تھی۔ سارے لوگ خوش تھے زندگی کی ایک مچلتی ہوئی لہر گھر بھر میں دوڑ گئی تھی — وہ کمزور ہوتی جا رہی تھی لیکن نقاہت کے اس پردے میں اس کی بیتابانہ مسرتیں چھپی ہوئی تھیں۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی کرنوں کی طرح اس کا چہرہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ فیض نے بار بار اسے ڈاکٹر کو دکھانا چاہا مگر پروین کو ڈاکٹر کے نام سے وحشت

ہونے لگتی۔ ایک مبہم سا خوف اس کے سارے جسم کو کپکپا دیتا۔ شاید شاید یہ اس کی روح کا ایک فریب ہو۔ اور اگر یہ صرف ایک خواب تھا تو وہ اسے ہمیشہ اپنی آنکھیں بند کئے دیکھتی رہنے کی آرزومند تھی۔

اس کی مسہری کے چاروں طرف دیواریں خوبصورت سے فریم میں کئی تصویریں فیض نے لا کر خاص طور پر اپنے ہاتھوں سے لگائی تھیں کسی کے بال گھنگریالے تھے، کوئی پھولے پھولے گالوں والا بچہ منہ پھاڑے ہوئے ہنس رہا تھا اور کسی کا مسکراتا ہوا پیارا سا چہرہ کوئی ٹھمک ٹھمک کر اس کی گود میں آنے کو مچل رہا تھا اور کسی طرف سے بلکتا ہوا بچہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اسے بلا رہا تھا۔ پروین کو ان تصویروں سے شدید طور پر محبت ہو گئی تھی۔ یہ سارے بچے اسی کے تھے صرف اسی کے بارہ سال سے چھپے ہوئے یہ ہنستے بلکتے اور ہمکتے ہوئے اتنے سارے بچے ایک ہی دفعہ اس کی خالی گود میں آنے کو مچل رہے تھے، پروین انھیں دیکھ کر کبھی کبھی تڑپ سی جاتی۔ وہ ان کے نزدیک جاتی پھولے پھولے گالوں اور بلاتی ہوئی ننھی ننھی انگلیوں کو دیوانہ وار چوم چوم کر کہتی "میرے بچے میرے لال ہیں کیسے تمہیں اپنے کلیجے میں بٹھا لوں" — سجے ہوئے کمروں کو دیکھتی ہوئی وہ انتقام سوچتی — تمہاری سفیدیاں میرے دل پر چرکے لگاتی رہی ہیں، اب یہاں ہر ہر جگہ دھبے نظر آئیں گے، دودھ کی شیشی رہے گی ہور لکس کی بوتلیں رہیں گی اور دہکتی

ہوئی انگیٹھی اور ہر طرف اس کی راکھ بکھری پڑی رہے گی وہ اس کوٹھی کا منہ چڑھا چڑھا کر بہت سی الگنی ٹانگے گی اور ان کرسیوں پر بھی بہت سے بے ہنگم سے کپڑے پھیلے رہیں گے۔ اس گھر کی ترتیب وارستگی سے وہ تھک گئی تھی۔ اسی لئے ہر ہر طریقے سے وہ اپنی روح کی اس بیزاری کا اعلان کرے گی ۔۔۔ گلاب بہت زیادہ نزدیک رہکر اب اس سے دور ہوتا جارہا تھا۔ پروین کی نگاہیں پھولوں کے حسین ڈھیر میں اپنے لئے ایک انوکھے پھول کا انتخاب کر رہی تھیں۔ مگر اس کا وہ لہکتا ہوا پھول اس کے تخیل سے بھی بہت بلند تھا۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے بہت سے خیالات اس کے دماغ میں چکر لگاتے رہتے کبھی تصویریں ہتھیلی کی نازک پنکھڑیوں کی طرح ننھے ننھے سے ہاتھوں کو بیتابانہ چومنے لگتی اور کوئی "امی! امی" کہتا ہوا اسکے کلیجے سے لپٹ جاتا مگر کبھی کبھی یاس کے ہیبت ناک جھولے میں اس کا مضطرب دھڑکتا ہوا دل جھولنے لگتا۔ "ہاں"۔ "نہیں"۔ "ہاں"۔ "نہیں"۔۔۔! جھولے کی پرانی رسی ہر ایک پینگ لینے پر چچارہی تھی اور پروین یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ "ہاں اور "نہیں" کے کس کنارے پر گرے گی۔ کاش یہ چچاتی ہوئی رسی کبھی نہ ٹوٹے اور وہ "نہیں" سے گذرتی ہوئی بھی "ہاں" کے وقتی کناروں سے ٹکرا کر جھولتی رہے۔۔!

گلاب کی ایک ٹوٹی ہوئی ننھی سی کلی گھوش بابو نے گلاب

کے ہاتھ میں دیکھ لی۔ باپ کی نگاہوں کو پہچان کر گلاب سہم گیا۔ گھوش بابو اپنا غصّہ برداشت نہ کر سکے وہ زور سے چلّائے "نکلو یہاں سے، نکلو یہاں سے" گلاب اپنی آنسوؤں سے بھری ہوئی حسین آنکھوں کو اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے ملتا ہوا اپنے گھر کے پھاٹک سے باہر نکل آیا اور روتا ہوا گلاب دوسرے پھاٹک سے ہو کر سیدھا پروین کے پاس چلا آیا اور اسکی گود میں منہ چھپا کر سسک سسک کر رونے لگا۔ پروین کی آنکھیں بھی پر نم ہو گئیں اور وہ فطرت کی اس غلط تقسیم کو اپنے سینے سے لگائے اسے زور زور سے بھینچ کر پیار کر رہی تھی۔ گلاب پھر اپنے کھیل میں لگ گیا۔ وہ کمرے میں دوڑ دوڑ کر چوں چوں کرکے پھدکتی ہوئی گوریا کو پکڑنے لگا۔ اس نے گوریا کی دم پکڑنی ہی چاہی تھی کہ اس کے ہاتھ کی ٹھوکر سے میز پر رکھا ہوا گلاس چھن سے گر کر چور چور ہو گیا۔ گلاب اپنی جگہ پر سہم گیا۔ یک بیک اس کے ننھے ننھے ہاتھ اوپر اٹھے اور وہ اپنے کان کو پکڑے کونے میں کھڑا ہونے کو جا رہا تھا کہ پروین دوڑتی ہوئی آکر اس سے لپٹ گئی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا: "میرا بچہ! میرا لال"! پروین کو تو یہ "چھن" کی آواز بڑی پیاری لگی تھی اور کاش وہ اس پیاری سی آواز کو ہر روز سنتی رہتی۔ گلاب کے لیے اسکے قصور پر پروین کا اتنا بیتابانہ پیار ایک نئی چیز تھی۔ وہ اسے حیرت سے تکتا ہوا اپنا سفید سفید ہاتھ پروین کے گلے میں ڈال کر محبت بھری خوشامد سے کہنے لگا:۔

"امّی! امی!"

پروین کی صحت کی کمزوری سے گھبرا کر آخر فیض نے لیڈی ڈاکٹر کو بلا ہی لیا۔ ذبح ہوتا ہوا بکرا جس طرح قصائی کی چمکتی ہوئی چھری کو دیکھکر لرز جاتا ہے اسی طرح پروین لیڈی ڈاکٹر کو دیکھکر کانپ گئی۔ امیدوں کے جھولے میں زور زور سے پینگیں پڑنے لگیں اور جھولے کی وہ پُرانی چچچاتی ہوئی رسّی اس کے سامنے ٹوٹتی ہوئی سی لگ رہی تھی "ہاں"۔ "نہیں" دونوں کناروں سے اس کی روح زور زور سے ٹکر کھا رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا کہ وہ اپنا آخری انجام نہ دیکھ سکے۔ جھولے کی رسی ٹوٹ رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اپنا فیصلہ سُنا دیا تھا۔ اس کی روح میں ایک زبردست دھماکہ ہوا اور اس کو لگا جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھا گئے ہیں۔ کوٹھی کے سفید چونے اور کمروں کی سجاوٹیں اس طوفان میں بجلی کی طرح رہ رہ کے چمک رہی تھیں۔ ہنستی بلکتی اور ہمکتی ہوئی تصویریں گہری تاریکیوں میں چھپتی جا رہی تھیں۔ ایسے اندھیرے اور ایسی آندھی میں اس کے کانوں میں ایک آواز آئی "امی تا" اور اسکی دیوانہ وار روح بیتابانہ طور پر دوڑتی ہوئی اسے پکڑنا چاہ رہی تھی مگر اس بڑھتے ہوئے طوفان میں آواز کا فاصلہ دور ہٹتا جا رہا تھا "امی تا" "امی تا" اور پھر ہولناک اندھیرے میں یہ آواز ہلکی ہوتی ہوتی ڈوب کر رہ گئی۔! فطرت اتنے دنوں تک پروین سے ایک ہولناک

آنکھ مچولی کھیلتی رہی تھی اور پردیس کے بے بس ہاتھ "امی تا"۔ کی اس آواز کو نہ پکڑ سکے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں تکیہ سے لپٹی ہوئی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "میرے بچے میرے لال!"

پکار

نعمو کو لگتا جیسے اس کی دادی اماں کی عمر کا بہاؤ بڑھاپے کے باندھ سے رکا ہوا بس ہمیشہ سے ایک ہی جگہ پر ساکت ہو گیا ہے وہ چھوٹی سی تھی جب بھی دادی اماں موقع بے موقع نکیلے دانتوں والی کنگھی اور ڈورے لئے اس کے پھیرے لگاتے ہوئے آزاد بالوں کی جڑوں کو کسنے کے لئے تیار رہتیں، اور اب جبکہ نعمو گڑیوں کے کھیل کھیلتے کھیلتے تھک کر بیزار ہو چکی تھی اس کی رگوں میں تیزی سے خون دوڑتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا اور اس کو یہ لگتا تھا کہ آسمان پر سے اُڑتی ہوئی چڑیوں کو جھپٹ لے یا زمین پر اتنے زور زور سے چلے کہ اس کے جسم کے عضو عضو رقص کرنے لگیں۔ تب بھی دادی

اماں اسی مستعدی سے اپنی نگہبانی کا جال پھیلائے نغمو پر نظروں سے پیچھے لگائے بیٹھی رہتیں اسے حیرت ہوتی کہ اس بیچ اتنی تبدیلیاں ہوگئی تھیں مگر دادی اماں اپنی جگہ پر جیسے کیل سے گاڑ دیگئی ہوں، جس میں نہ تو کوئی حرکت ہی تھی اور نہ کوئی تبدیلی، نغمو نے جنم سے انکے بال برف کی طرح سفید ہی دیکھے تھے۔ سوکھے ہوئے سردے کی طرح سکڑی سکڑائی ہوئی دادی اماں اسے ہمیشہ سے ایک ہی جیسی لگتیں۔ جب وہ اپنی بڑی بڑی بے رونق آنکھیں دکھا کر کسی کو ڈانٹتیں تو کبھی کبھی نغمو کو بھی ڈر لگنے لگتا تھا۔ انور نے ایک دن بوٹونی پڑھاتے ہوئے اسے سمجھایا تھا کہ درختوں کے تنوں میں ہر گذرتا ہوا سال اس کی عمر کی ایک جھری کے دائرے کا اضافہ کرتا رہتا ہے جس سے درختوں کے سن کا پتہ بہت آسانی سے مل جاتا ہے۔ نغمو بڑے غور سے دادی اماں کے چہرے کو دیکھتی مگر انکی جھریوں میں اسے کوئی اضافہ نظر نہیں آتا، دادی اماں نہا دھو کر اپنے روئی کے جیسے بال دھوپ میں سکھاتیں تو نغمو کا جی چاہتا کہ ان کے چمکتے ہوئے تاروں پر اپنا ہاتھ پھیرتی رہے، مگر دادی اماں کی چڑچڑی طبیعت سے اسے ڈر لگتا۔ وہ اکثر یہ سوچتی کہ یہ دادی آخر اتنا غصہ کیوں کرتی ہیں؟ بچے سارے گھر بھر کے پیارے ہوتے مگر دادی اماں کی آنکھوں کے خار، چیختے چلاتے لڑکے اور اچھلتی کودتی ہوئی لڑکیاں انکے ہاتھوں سے روز ہی دو چار دھموکے کھاتی رہتیں، مگر نغمو کو تعجب

لگتا کہ پھیلائے پر پڑے ہوئے ہاتھ پھیلا پھیلا کر بکنے والے چھوٹے چھوٹے بچوں سے انھیں کاہے کی بیر تھی؟ جب وہ دادی اماں کی بکتی ہوئی آواز سنتی کہ "اُن بچوں سے کتنی نجاست ہے" تو اس کا جی چاہتا کہ دادی اماں کی اس بھول کو یاد دلا دے کہ خود انھوں نے پہلے ہی سے کتنی نجاستیں پھیلا رکھی تھیں۔ اُسے بڑا غصہ آتا یہ بڑھیائیں اتنا بکنے کیوں لگتی ہیں، دادی اماں کے گلے میں بدرنگ ڈور کے اندر چاندی کی تلوار جیسی دانت کھودنی سے اُسے بڑی گھن لگتی اور وہ بڑے تعجب سے دیکھتی رہتی کہ تیزی سے دانتوں کو جھنجھوڑتی ہوئی وہ اپنے بکنے کی رفتار کو جاری رکھتی ہیں۔ نمو کو بڑھیوں کی لچھے دار بک بک اور ان کے مسلسل دانت کھودتے رہنے سے بڑی نفرت تھی اور اس کی چڑھ اس وقت انتہا تک پہنچ جاتی جب دادی اماں انور کو آتا ہوا دیکھ کر ٹھیک نمو کے پڑھنے کی میز کے سامنے اپنی سوکھی سوکھی ٹانگوں کو سفید بگلے جیسی ساڑی میں لپیٹی ہوئی برآمدے کے پائے سے لگ کر چھپا پر ایک پہرے دار کی طرح بیٹھ جاتیں۔ ایسے وقت میں انور کو دادی اماں کسی بہت بڑے خزانے پر بیٹھی ہوئی ایک اژدہا جیسی لگتیں۔

دادی اماں کی ذات گھر بھر پر چھائی ہوئی تھی پھر بھی انھیں اس کی شکایت تھی کہ میری ہستی ہی کیا ہے کھانے پینے کپڑے لتے سے لے کر چال ڈھال ہنسی بولی اور بات چیت تک پر

انکی حکومت تھی اپنے زور سے کیوں چلے بنی کیوں چیخی اور نمو کی ہنسی کس لئے؟ جوان جہاں بیٹیاں ہنس ہنس کے جب انگریزی پڑھنے لگیں اور وہ بھی دور کے جوان رشتہ دار سے تو پھر گھر میں برکت کاہے کی رہے گی۔" اور دادی اماں اپنی بڑی بڑی آنکھیں انتقامی طور پر دکھاتی ہوئی کہتیں۔ کیا ان پر جوانی نہ آئی تھی کبھی؟ مگر یہ دیوانگی تو نہ تھی۔"! اسوقت نمو منو اور انور ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنستے ہوئے یہ سوچتے" کہ کاش کہیں سے دادی اماں کی اس کھوئی ہوئی جوانی کے صحیفوں کو وہ الٹ سکتے۔" دادی اماں کو نوجوانوں اور بچوں سے ایک ازلی چڑھ تھی شاید وہ سمجھتی تھیں کہ فطرت اپنے خزانے کی تنگی کی وجہ سے حیات تازہ کی لہریں ایک سے چھین کر دوسرے کو دیتی رہتی ہے اور وہ اپنی کمزور نگاہوں سے اپنی چھینی ہوئی تجلیوں کی چمک دوسری جگہ نہ دیکھ سکتی تھیں، بلندیوں سے زمین کی طرف بے سہارا گرتی ہوئی دادی اماں زینے پر چڑھنے والوں کو کس نظر سے گوارا کر لیتیں؟

نمو، منو، پرویز سارے ہی اپنے راستے پر دوڑتے جا رہے تھے مگر بچاری دادی اماں سامنے موت کی گنبد کی طرف ایک تنگ پگڈنڈی پر آہستہ رینگ رہی تھیں کاش وہ اپنی رفتار کو بند ہی کر سکتیں۔

پڑھتے پڑھتے اکتا کر نمو کی نگاہیں دادی اماں کی جھولتی ہوئی جھریوں والے چہرے پر جم جاتیں اور سوچتی کیسا اچھا ہوا

جو دادا ابا زندہ نہ رہے نہیں تو یہ دونوں ملکر زندگی کیسی اجیرن کر دیتے، مگر بچاری دادی اماں“ وہ کرہی کیا سکتی ہیں اس کا؟ میز کے قریب پایہ سے لگی ہوئی بڑھیا کی اہمیت چونے سیمنٹ اور اینٹ والے بیجان پایے سے زیادہ نہ تھی۔ کتابوں سے چھلکتی ہوئی نگاہیں گردش کرتی ہی رہتیں اور ڈرائنگ کی پنسل کے ساتھ غیر ارادی طور پر انگلیاں ایک دوسرے سے ملتی ہی رہتیں!۔

انور احسان مند تھا دادی کی نگاہوں کی پاسبانی دوسروں کے لئے قابل اعتماد تھی اور بیچاری اماں کا تصور خط مستقیم اور خط منحنی کی آواز پر چکر لگاتا ہوا انکی نگاہوں کو گذری ہوئی یاد اور لبریز ہوئے دنوں کی جھلک دکھاتا رہتا۔

دادی اماں انور کے جانیکے بعد سارا دن چوکی کے فرش پر بیٹھی رہتیں یا لیٹ جاتیں ان کا ہمیشہ سے یہی طریقہ تھا وہ سارا دن محلہ کی آئی گئی لوگوں، کباب بسکٹوں والیوں، انڈا اور ترکاری بیچنے والیوں سے دیر دیر تک عجیب عجیب انداز سے مزے لے کر باتیں کرتی رہتیں۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں اپنی بڑائی کا غرور جھلکتا، وہ اتنی دلچسپیوں سے گفتگو کرتیں جیسے گھر سے کبھی نہیں نکلنے کے باوجود سارے گھروں اور سارے ہی لوگوں کو ایسے جانتی ہیں جیسے اپنے گھر کے لوگوں کو۔ وہ باتیں کرتی

کرتی اس کی گہرائیوں میں ڈوب جاتیں پھر کبھی زور زور سے تنقید کرنے کی آواز آتی اور کبھی رازدارانہ سرگوشی کے ساتھ سر اور آنکھیں آہستہ آہستہ صرف جنبش کرنے لگتیں۔ نغمو دور سے دیکھتی رہتی دادی اماں کی آنکھیں کتنے ناول اور کتنے افسانوں کو اس آسانی سے پڑھتی جاتی تھیں۔ کون کہتا ہے کہ ان کی دنیا محدود ہے۔ کاغذ بچھو پتھر اور سارے بکھیڑوں سے یکسر آزاد کیسی آسانی سے سچی کہانیاں روز کتنی پڑھتی جاتی تھیں۔

دنیا کی ساری بڑھیوں کی طرح دادی اماں کو بھی طرح طرح کے کھانے بہت پسند تھے۔ باتیں کرنے کے علاوہ انھیں اس کی بڑی فکر رہتی کہ اس وقت کے کھانے میں کیا ہے اور اس گھڑی کیا رہے گا؟ بچارہ پرویز کتنی ہی کوشش کرتا لاکھ سر پٹکتا کہ گھر میں مرغیاں رہیں اور انڈا دیں وہ اپنی گود میں چھوٹے چھوٹے بچے لئے پھرتا رہتا مگر دادی اماں کے نوکیلے تیز دانت ایک بھی چوزا، مرغی، بٹیر یا چاہا نہ چھوڑتے۔ بچارے بچے اپنے ذبح کئے ہوئے پالتو چوزوں کے اکڑے ہوئے جسم کو بڑے غم سے دیکھتے ان کی غصیلی آنکھوں میں دادی اماں ایک ڈائن کیطرح نظر آئیں جو دوسروں کی زندگی کھا کھا کر اپنی حیات کو سینچ رہی تھیں۔

نغمہ کی یاد میں دادی اماں بہت مشکلوں سے صرف ایک دو بار کہیں گھر سے باہر ملنے ملانے گئی تھیں۔ مگر ایک

دن جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ان کے سگے بھانجے ڈپٹی صاحب کی طبیعت خراب ہے، تو پھر اُن سے نہ رہا گیا۔ ان کے مرحوم شوہر کی بہن کا اپنا بچہ ان کا کوئی غیر نہ تھا وہ اپنے بچھڑے ہوئے شوہر کی یاد کو برقرار رکھنے کے لئے ان کے بھانجے کو بغیر دیکھے ہوئے نہ رہ سکیں۔ اس دن انہوں نے اپنی اچھی دُھلی ہوئی سفید ساڑی پہنی آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ "دارالسلام"۔ اپنا ہی گھر ٹھہرا اسی لئے نمو کو اپنے ساتھ لئے تھک کر چور پریشان حال ہو کر ڈپٹی صاحب کے گھر پر اتریں۔

دادی اماں نمو کو لے کر بڑے کمرے میں چوکی کے فرش پر گاؤتکیہ لگا کر بیٹھ رہیں۔ سامنے خاصدان میں پان، زردہ کی ڈبیا اور عطردان رکھا گیا۔ لیکن بچاری دادی اماں تھک کر نڈھال ہو رہی تھیں۔ بڑی مشکلوں سے وہ پان لے سکیں مگر نمو کو پان لینے سے روک دیا کہ پڑھنے والیوں کی زبان موٹی ہو جاتی ہے اور کنواریاں عطر نہیں لگایا کرتیں۔

دادی اماں کو یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ان کے بھانجے اب پہلے سے اچھے ہیں ڈاکٹروں نے تو جواب تک دیدیا تھا۔ مگر اللہ نے فضل کیا پھر بھی بڑھاپے کی جان ہے کہاں سے طاقت آئے" دادی اماں گاؤ تکیہ سے لگی لیٹی ہوئی تھیں اچانک بیٹھ گئیں انھیں کہنے والوں کی باتیں بہت بری لگی تھیں۔

کون سراج ؟ بھلا کا ہے کو ایسا بوڑھا ہونے لگا ؟ جب میں بیاہ کر آئی تھی تو اس کی مسیں بھی نہ بھیگی تھیں، یہی کوئی دس بارہ سال ہوئے جب اسے آخری بار دیکھا تھا اب بھلا اتنے سالوں میں بڑھاپا کیا اس پر برس پڑا !

فرش پر بیٹھتے ہی نعمو نے دریچہ سے لگ کر جیسے ہی باہر کیطرف دیکھا، اس کی آنکھیں بے اختیار مسرت سے جھلک پڑیں، مکان کی پشت دو گز کے فاصلے پر ٹھیک سینما ہال کی طرف تھی اسے سینما آئے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا اور اب اس کو یاد بھی نہ رہا تھا کہ سینما ہاؤس کس طرف ہے ! خوبصورت اور رنگین اشتہاروں سے چھپی ہوئی سینما ہال کی دیواریں۔ کچھ بند اور کھلے ہوئے دروازے اور سب سے بڑھکر زنانے دروازے کا ہلتا ہوا پردہ نعمو کو پکار پکار کے دعوت دے رہا تھا۔

وہ ناشتہ چائے اور ساری باتوں سے بے نیاز ہو کر دریچہ سے لگی ہوئی اپنی بھوکی نگاہوں سے اس طرف تک رہی تھی، دادی اماں کی آواز اس کے کانوں میں جا تو رہی تھی مگر اس کی نگاہیں دریچہ کے سامنے سینما ہال پر جم کر رہ گئی تھیں جہاں طرح طرح کی ساڑیاں قسم قسم کے کوٹ اور نئے نئے ڈیزائن کی چادریں اپنے شانوں پر ڈالے ہوئے لڑکیاں اور قیمتی سوٹ پہنے ہوئے لڑکے کھیل ہونے سے کہیں پہلے ہی آ کر خود اپنی نمائش کر رہے تھے۔

نعمو نگاہوں نگاہوں میں ہی دریچے کے سنگین جنگلے کے

اس بار اس رنگ و بو کی دنیا میں خود کو بھی آزاد محسوس کر رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے یہ بھول گئی تھی کہ دادی اماں کے سخت گیر پنجے اس کی خوشیوں کا گلا دبوچے ہوئے ہیں۔ ایک دفعہ دادی اماں سے چھپ کر اپنی امی کے ساتھ سکنڈ شو میں سینما دیکھنے گئی تھی فلم "پکار" نے اس کی روح کو ایک پکار دیا تھا مگر دادی اماں کے ڈر سے وہ پھر کبھی نہ جا سکتی تھی۔

دادی اماں کو سراج کو دیکھنے کی رٹ لگی ہوئی تھی مگر جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ انہیں کوٹھے پر چڑھنے کی تکلیف اٹھانی پڑے گی تو یکبارگی ایسا معلوم ہوا جیسے ان کے سارے حوصلے پست ہو گئے۔ پھر بھی انہیں اپنی بات رکھنی تھی اور صرف اسی دیکھنے کی خاطر وہ اتنی پریشان ہوکر آئی تھیں۔ انہوں نے نعمو کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہا مگر نعمو کنمنائی، اس نے اپنے تماشے میں محو رہنا زیادہ پسند کیا اور بچاری دادی اماں وقت کی نزاکت کا احساس کرکے کسی دوسرے کے سہارے آہستہ آہستہ ہانپتی کانپتی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھتی ہوئی اپنے بھانجے سراج کی مسہری تک پہنچیں۔ اوپر پہنچتے پہنچتے وہ بدحال ہو گئی تھیں اور سردی کے باوجود پسینے ان کی پیشانی سے چھوٹ رہے تھے۔

دادی اماں اپنے بھانجے سراج کے سرہانے ہانپتی ہوئی کھڑی تھیں مگر ان کی نگاہیں داڑھی اور مونچھوں کے الجھاؤ میں الجھ کر

رہ گئی تھیں وہ بڑی مشکلوں سے اپنی نظروں کو وہاں پر سے ہٹا سکیں ۔ بیچارے ڈپٹی صاحب کچھ نہ بول سکتے تھے ۔ اشارے سے صرف سلام ہی کر سکے ۔ ان کے ہاتھ کی کہنیاں کلائی اور جبڑے کی ہڈیاں عجیب بھیانک طور پر باہر نکلی ہوئی تھیں ۔ اتنا بڑا تغیر صرف دس بارہ سال کے عرصہ میں دادی اماں حیران ہو کر تک رہی تھیں ۔ وہ تو سوچ بھی نہ سکتی تھیں کہ ان کا بھانجہ بڑھاپے کی اس منزل تک پہنچ گیا ہے ۔ اپنے بھانجہ کی بیمار کھوکھلی نگاہوں کو دیکھتے ہی انہیں شدید طور پر ایک احساس ہوا جیسے یکایک جوانی کی تیز لہریں ان کی رگوں میں دوڑ گئیں ۔ بڑھاپے اور بیماری نے ڈپٹی صاحب کو موت کی آخری منزل تک پہنچا دیا تھا ۔ اور انھیں دیکھکر جیسے دادی اماں کو کچھ دنوں کے لئے ٹھہر کر دم لینے کا سہارا مل گیا ۔ مسہری پر پڑے ہوئے ایک مجبور بے لبس انسان کو دیکھتے ہی انھیں یہ محسوس ہونے لگا کہ وقت سے پہلے ہی ان پر بڑھاپے کا غلط الزام لگا رکھا ہے بڑھاپے کی منزل تو یہ ہوتی ہے ۔ اور دادی اماں تو ان مجبوریوں سے کہیں دور تھیں ۔ خاموشی سے سرہانے کھڑی ہوئی دادی اماں اپنے پیروں میں ایک نئی طاقت محسوس کر رہی تھیں ، آنے والی موت کے خیال سے ان کے رونگٹے کانپ گئے ۔ وہی موت جو اس مسہری کے گرد منڈلا رہی تھی ، وہ اس جگہ زیادہ دیر رہنا نہ چاہتی تھیں ۔ انھوں نے جھک کر بڑی محبت اور ہمدردی سے عنقریب ہی مرجانے والے سراج کی پیشانی پر ہاتھ پھیر کر کہا ! گھبراؤ مت سراج !

جلد ہی اچھے ہو جاؤ گے"۔۔۔! مریض نے اپنا کمزور ہاتھ اٹھا کر ایک آخری سلام کیا، دادی اماں کو دعائیں دیتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔ جیسے وہ اپنے بڑے کو دعا دے رہی ہوں۔ وہ جلدی جلدی تیزی سے زینہ طے کرتی ہوئی نیچے آئیں۔ وہ بڑی مشکلوں سے اپنے تھکے ہوئے منتشر سانسوں کو روک رہی تھیں مگر ان کے چہرے پر مسرت کی سرخی چھا رہی تھی اور انھیں لگ رہا تھا جیسے کسی نے ایک بڑا بوجھ ان کے سر سے اتار دیا ہو۔ وہ مطمئن انداز میں گاؤ تکیے سے لگ کر سیدھی ذرا تن کر بیٹھ گئیں، بچارہ مزاج بہت بدل گیا ہے نہ۔ اپنی اپنی مٹی، کیسا خراب تھا بیچارے کا باڑھ ۔۔۔"

نعمو اپنے سے قریب ہی دادی اماں کی آواز سنکر چونک پڑی۔ نعمو پر جھکی ہوئی دادی اماں دریچے کا ایک اور پٹ کھولتی ہوئی مسکرا کر بولیں۔

"کیا ہے نعمو؟"

"سنیما ہال ہے دادی اماں یہاں روز تماشے ہوتے ہیں۔ بڑے اچھے اچھے بولنے والے اور گانے والے" نعمو نے ڈرتے ڈرتے ذرا تفصیل سے کہا۔

دادی اماں کی کچی پکی کھچڑیا بھویں ان کی پیشانی کی ٹیڑھی ترچھی لکیروں میں قوس و قزح کی طرح اوپر اٹھیں۔ چمکتی ہوئی آنکھیں

نمو کے چہرے پر جم کر رہ گئیں اور پک کر سڑے ہوئے چھلکے کیطرح ان کے لبوں کو جنبش ہوئی اور اچانک طور جیسے بے اختیار ان کی زبان سے نکل گیا۔

" نمو بیٹی چلو نہ ہم بھی سینما دیکھ آئیں ۔"

بیچاری

بیچاری

گھر گھر کی ایک عجیب موسیقی سارے گھر بھر پر چھائی تھی، چکی کا ایک موٹا پاٹ مسلسل گھوم رہا تھا۔ مٹیالے رنگ کی بھوسیاں اور مسور کی لال لال چکنی چکنی دال چکی کے گرد جھر جھراتی ہوئی گر گر کر ڈھیر لگتی جا رہی تھی، اور وہ اسی طرح دال بھوسی اور مسور کے گردے کے بین میں لت پت زور زور سے چلاتی رہی۔

بالوں کا ایک گرد آلود گھوپا اس کے سر پر چھا رہا تھا۔ وہ دونوں پاؤں پسارے اپنے سارے جسم کو آگے اور پیچھے کی طرف جھٹکے دے دے کر مسور کے ایک ڈھیر میں بیٹھی دال دلتی جا رہی تھی۔ چکی چلاتے وقت اس کے لبوں پر کوئی گیت لہرا نہیں رہا تھا

دور تک کھنچے ہوئے اس کے ہونٹ اس وقت بھنچے ہوئے تھے اور اس کی اداس نیم نگاہوں میں جیسے ماضی کے دور دراز خواب جھلک رہے ہوں۔ تقدیر کے ایسے ہی بھاری پتھروں کی گردش میں اس کی اپنی زندگی بھی پس چکی تھی اور اب وہ حال کے اندھیروں میں اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے زندگی کے لامعلوم دروازے کو ٹٹولتی ہوئی مستقبل تک پہنچنے کا کوئی اجالا سا راستہ ڈھونڈ رہی تھی —! کام کرنا کوئی عیب نہ تھا، وہ کلکتہ اور رنگون کی کمائی کی بہاریں دیکھ چکی تھی، پھر یوٹ کی اندھی لٹس کی ریل پیل اپنے بھرپور ہاتھوں سے اس نے کتنا لٹایا تھا اور اپنے اسی گاؤں میں اپنے بھائی بندوں کی حیران نگاہوں کے سامنے اس کا شوہر اپنی قوت بازو کے نشے میں چور تماشے کے طور پر اپنی کمائی کے روپے کو امارت کے گھمنڈ میں تالاب میں مچھلی پر نشانہ لگا کر پھینکتا اور ایک دفعہ اس نے دس دس روپے کے نوٹ کا سگرٹ بنا کر دھواں بھی اڑا دیا تھا —! ہری، لال، پیلی اور بنسوکھے رنگ کے ریشمی آنچلوں کے کتنے ہی پھریرے وہ ہواؤں میں لہرا چکی تھی۔

گھر وہی تھا وہ بھی وہی تھی اور ساری چیزیں بھی ویسے ہی تھیں، مگر وقت گزر چکا تھا۔ خود اس کے اپنے ساتھ اس کی بعض چیزوں میں تبدیلی آ گئی تھی، تنی ہوئی سُتلی کی سفید پلنگ میل سے چٹی ہو کر اب جھولنے لگی تھی۔ اور ان کی لمبی لمبی ٹوٹی ہوئی ڈوریاں زمین پر مچلتی رہتیں۔ مگر ان کے علاوہ رینگتے بلبلاتے میلے کچیلے اس

کی جان کو کھانے والے بچے اب ذرا بڑے ہو کر نکھر گئے تھے۔ ان کی بجبجاتی ہوئی ناکوں پر سے مکھیاں اڑ چکی تھیں اور وہ دن بھر میں کئی کئی بار اپنے اسارے میں مٹی کی پیلی اور چکنی دیوار میں ایک ٹوٹے ہوئے آئینے کے جڑے ہوئے ٹکڑے میں اپنا منہ آکر دیکھ لیتے تھے!

اپنی عمر کے پندرہ سال سے ایک ہی کام کرتے کرتے وہ بیزار ہو چکی تھی، اور اب جبکہ اس کا جی تھکا تھکا سا لگتا تھا اسے اس بات کی خوشی تھی کہ انسانی کلبلاتے ہوئے کیڑے اس کی گود میں رینگتے نہ تھے۔

اپنی زندگی کی مسرت اور سارا آرام اس نے ان ہی پلپلے سے بچوں کے پیچھے حرام کر دیا تھا۔ اور اب وہ آزاد تھی، ساری کی ساری راتیں اس کی اپنی تھیں، اب اس کا جتنی گھڑی جی چاہتا سو کر اُٹھتی، ساری گھرداریاں اس کی لڑکیاں کرتیں اور لڑکے سب صبح اٹھتے ہی باسی تازہ کچھ کھا کر گلی ڈنڈا، غلیل اور لٹو لے کر گلیوں اور پہاڑوں کے دامن میں کھیلنے کو چلے جاتے تھے۔ آنکھوں کا اندھا ایک شوہر تھا جس کا خوف اس کے پیسے کے ساتھ مٹ چکا تھا۔ وہ اکیلا بیٹھا اپنی لاٹھی زمین پر پٹک پٹک کر بکتا رہتا۔ مگر اس گھر میں اس آواز کی کوئی پرواہ نہ تھی ــــ! لیکن اس کی آنکھوں کے ساتھ اس کا پندار بھی ایک دم سے اندھا نہ ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے گھر میں اپنی کھوئی ہوئی جگہ حاصل کرنے کے لئے وہ کئی کئی طرح کے جتن کرتا۔ اندھیرے میں بیٹھا ہوا وہ تھوڑی سی، گول مرچ، سونف اور کالا نمک چوسطے کی

مہین چھنی ہوئی راکھ کے ایک ڈھیر میں ملاکر ہاضمے کی گولیاں بناتا، اور اسی طرح آنکھوں کا سرمہ بھی بنایا کرتا تھا، میلے اور صاف کاغذ کی پڑیوں کا جب ایک تشفی بخش انبار لگ جاتا تو وہ انہیں ٹٹول ٹٹول کر اپنے انگوچھے میں رکھ کر دو چار موٹی موٹی گرہیں لگا کر اپنے کثیف بستر کے نیچے چھپا دیتا۔ جب سے اس کی آنکھوں کی روشنی چلی گئی تھی خود اپنے لوگوں پر سے بھی اس کا اعتبار ختم ہو گیا تھا۔ کبھی بہت ہی صبح سویرے اور کبھی شام کے دھندلکے میں اپنی بنائی ہوئی دواؤں کی گٹھری لئے وہ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے سہارے جس پر ابھی اسے بھروسہ تھا۔ گھر سے باہر نکل جاتا۔ وہ کہاں کہاں جاتا کدھر کدھر مارا پھرتا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا۔ وہ اکثر آٹھ آٹھ دنوں کے بعد گھر آتا اور کبھی پندرہ پندرہ دن بھی گذر جاتے تھے۔ مگر وہ جب بھی گھر واپس آتا تو اس کی چال میں پہلی سی رعونت ہوتی اور اُس کی اپنی ذرا بھاری سی گرجدار آواز چند لمحوں کیلئے گھر کے کونے کونے میں گونج اٹھتی اس کے بیٹے کے سر پر اناج کی کبھی ہلکی اور کبھی بہت بھاری سی گٹھری ہوتی اور منیر کی کمر میں کھڑکھڑاتے ہوئے ایک ایک روپئے کے چند نوٹ رہتے اور کچھ جھنجھناتے ہوئے پیسے ہوتے اور سارے گھر بھر پر ایک مسرت سی چھائی رہتی، مگر یہ دنیا! — چین ہی کب لینے دیتی ہے کسی کو منیر کے گھر کا دو دن کا سکون گاؤں والوں سے دیکھا نہ گیا۔ ہاضمے کی گولیوں اور سرمہ کی پڑیوں کو وہ لوگ بھول گئے تھے۔ جتنے

منہ اتنی ہی باتیں، کوئی کہتا "اندھا منیر اب اتنا گزر گیا کہ بیٹے کا ہاتھ پکڑے گاؤں گاؤں سے پھر کر بھیک مانگ لاتا ہے۔ اندھی آنکھوں سے اب دور کی سوجھنے لگی ہے" زیادہ سے زیادہ تکلیف دہ اور دلوں کو چھیدنے والی عجیب عجیب سی باتیں پھیلتی رہتیں۔ لیکن منیر کو ابھی تک اپنے قوتِ بازو پر بھروسہ تھا اور پیسے کی طاقت کو وہ اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اسی لئے اس نے ان باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ لیکن اس کی بیوی نے بستی کے ایک ایک گھر میں جاکر اس بات کے لئے شور مچایا کہ "دنیا بھر کے ڈاکٹر حکیم وید کبیراج کیا سب کے سب بھیک منگے ہی ہوتے ہیں جو ایک غریب کو اس طرح سے ذلیل کیا جاتا ہے" منیر کی بیوی نے اسی بستی میں اپنے ہاتھوں سے اپنی دولت لٹائی تھی، اور سوائے چند بڑے گھرانوں کے سبھی اس کے مقروض رہ چکے تھے۔ گاؤں کی پتھریلی گلی میں چلتے چلتے وہ پچھلے دنوں کے خواب دیکھنے لگتی۔ اسی گلی کے نکڑ پر مٹی کی ان پرانی دیواروں سے نکلی ہوئی انہی کرچیوں میں اس کے سرسراتے ہوئے ریشمی آنچل کبھی کبھی اُلجھ اُلجھ پڑتے تھے۔ مگر اب دیواروں کی کرچیاں پہلے سے زیادہ نکیلی ہو ہو کر باہر نکل آئی تھیں اور اب بھی اکثر آتے جاتے منیر کی بیوی یا بیٹی کی میلی ساڑیاں ان کرچیوں سے اٹک اٹک کر پھٹ پھٹ جاتیں۔ منیر کی بیوی کو کبھی کبھی اس تنگ گلی کی دونوں طرف اونچی اونچی کرچیوں سے بھری ہوئی دیواریں ہیبتناک بھوتوں کی خوفناک زبانوں کی طرح نظر آتیں۔ جو اس کی خوشیوں کو دیک

کی طرح چاٹ گئی تھیں اور اب وہ نوکیلی سُرخ سفید اور مٹیالے رنگ کی ہزاروں دیمکیں اس کے دل و دماغ سے چمٹتی ہوئی اس کی روح میں رینگ رہی تھیں ـــ! اس کی زندگی میں کیا کیا انقلاب نہ آئے تھے پھر بھی اس نے اپنے ضمیر کو زندہ رکھا تھا اور اسے بس اسی کی خوشی تھی۔ وہ محنت سے گھبراتی نہ تھی۔ اور یہی ایک چیز ایسی تھی جس کی بنیاد پر کم سے کم وہ اپنی امیدوں کے گھروندے بنا سکتی تھی۔ ریلوے لائن کے کنارے یہ گاؤں آباد تھا۔ اس میں شریف مسلمانوں کے گھرانے ایک پہاڑی اونچے ٹیلے پر آباد تھے۔ یہ ٹیلہ دراصل اس گاؤں کی سربلندی کا علمبردار بھی تھا۔ ٹیلے کے نیچے کوری اور اچھوتوں کی ٹولیاں آباد تھیں جو رعیت اور محکوم ہوتے ہوئے بھی اب آہستہ آہستہ ٹیلے کی طرف اپنا سر ابھار رہے تھے۔ اکا دکا چھوٹے چھوٹے ٹھنٹھ درختوں والا صحرائی گاؤں بڑا پرسکون تھا۔ ٹیلے کے نیچے حدِ نظر دھان کے ہرے بھرے لہلہاتے ہوئے کھیت کا حسین منظر، ایک طرف سلسلہ وار اونچے سیاہ رنگ کے پہاڑ اور ان کے قدموں کے آگے مچلتی ہوئی وسیع برساتی ندی کا پیچ و خم کبھی سنہری ربیع کی فصل اور کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے سبز پودوں میں یاقوت کی طرح سرخ سرخ مرچوں سے لدے ہوئے دہکتے ہوئے کھیت بس یہی سارے خزانے تھے گاؤں بھر کے، ان میں سے کسی کا سرمایہ زیادہ تھا اور کسی کا کم، اور بہت سے لوگوں کا تو کچھ بھی نہ تھا۔ مگر آنکھیں سبھی کی ٹھنڈی ہوتی تھیں اور یہ بکھرے ہوئے حسن تو سب کے لئے یکساں طور پر تھے

ٹیلے پر بھی کثرت سے مکانات تھے۔ سربلند اونچے اونچے کوٹھے اور اُن سے لگے ہوئے پپیتے، امرود اور شریفے کی باڑیاں تھیں۔ مٹی کے وسیع لپے پُتے ہوئے سادہ مکان بھی تھے۔ پھونس اور پیال کے چھپروں والے نیچے نیچے تنگ گھروں کی بھی آبادی تھی۔ اور ان کے درمیان گلیاں تھیں۔ عجیب عجیب طرح کی بے ڈھنگی، اونچی نیچی پہاڑی گلیاں ــــ خاص خاص گھرانے والیاں کبھی کبھار آتے جاتے ذرا پہلے سے ان گلیوں میں پردے کرالیا کرتی تھیں۔ ان کے علاوہ ان گلیوں میں آزادیاں رہتیں اور جب کسی کا جی چاہتا بے جھجک ان میں آتا جاتا۔ ٹیلے پر آنے والی لمبی گلی میں اکثر شام کو مویشیوں کا ایک تانتا بندھ جاتا اور میلے کچیلے کسان ایک ہلکی سی آہٹ پر ہی اپنے انگوچھے میں منہ چھپا کر گردنیں موڑ لیتے تھے منیر کی بیوی کی طرح گاؤں کی اکثر غریب عورتیں صرف اپنی محنتوں سے اپنے گھر چلا رہی تھیں اور اونچے گھرانوں میں روز ہی کوئی نہ کوئی کام رہتا ہی تھا۔ سال سال بھر کے خرچ کی دالیں ایک ہی دفعہ دل کر غلے کی لمبی لمبی کوٹھیوں میں بند کردی جاتیں، منوں گیہوں چنے بنائے جاتے پھر چاول چھانٹا بنایا جاتا۔ کبھی جو بونٹ اور مکئی کے ستو پیسے جاتے تھے اسی طرح سارے گھروں کی چکی ان کے ہاتھوں چلتی رہتی اور اس کے ساتھ ان کی قسمتیں بھی ایک ہی محور پر گردش کرتی چلی جاتیں آہستہ آہستہ اور کبھی تیز رفتاری کے ساتھ۔ منیر کی بیوی کے ہاتھوں کے کام اس لئے زیادہ سراہے جاتے تھے کہ وہ دوسروں کی چیزوں

کی نگرانی بڑی ہمدردی سے کرتی۔ شاید اپنی چیزوں کو کھو کر اس نے یہ سبق سیکھا تھا۔ اسی لئے ہر گھر میں اس کی مانگ تھی۔ ساری چیزوں کو اپنے ٹھکانے پر لگا کر وہ اپنی دن بھر کی مزدوری آنچل کے ایک کونے میں باندھ کر اسی پتھریلی گلی کے باہر نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ شام کے دھندلکے میں اس کے لبوں پر ایک نڈھال مگر زخشندہ تصور چھایا رہتا۔ اور یہ دیہات کا ایک آمرانہ دستور تھا کہ دن بھر کے تھکے ہوئے مزدور کی اُجرت پیسے اور اچھے غلّے کی جگہ سب سے موٹا اناج دیا جائے۔

اپنے گھر سے باہر ہی رہنے میں اُسے کچھ سکون ملتا تھا۔ چکی کی گھر گھر اور ڈھینکی کے ڈھکر چوں میں اس کی پریشانیاں کچھ دیر کے لئے دور ہو جاتی تھیں مگر اپنے گھر میں نظروں کے سامنے چلتی پھرتی چٹان سے وہ کیسے آنکھیں بند کر لیتی اور بے سہارا اتنے بڑے پہاڑ کا بوجھ اسکے سینے پر سے کس طرح اتر سکے گا۔ یہ فکر ایسی تھی جس نے اسے دہلا رکھا تھا۔ طیبہ کا خوبصورت دمکتا ہوا چہرہ کبھی کبھی اس کے دل میں آگ لگا دیتا، وہ کیا کرے گی؟ اور اب تو اندھا منیر بھی چار مہینے سے بے کار ہو گیا تھا۔ بڑی پریشانیوں کے بعد اس نے طیبہ کا رشتہ قریب ہی ایک دوسرے گاؤں میں ٹھیک کر لیا تھا۔ اس رشتہ کے ساتھ اس کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ لڑکے کی ماں کتنی ظالم اور ڈائن ہے جس نے خود اپنی بیٹی کا کلیجہ نکال لیا ہو وہ ڈائن نہیں تو کیا تھی، سارے گاؤں والے چشم دید طور پر یہ بات جانتے تھے کہ اس عورت نے اپنے داماد سے خفا ہو کر سوتے میں

اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر کس بے دردی سے اُس پر مٹی کا تیل چھڑک کر اس میں آگ لگا دی تھی۔ اور جب وہ بے چارہ تڑپ تڑپ کر مر گیا تب کہیں جا کر اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ مگر دیہات کی پُرپیچ گلیوں میں یہ بات دَب دبا کر رہ گئی — اور یہ سب جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس گھر میں وہ اپنی بیٹی کو بھیجدینے کو تیار تھی۔ وہ انتہائی سرگرمی سے اپنے کاموں میں جٹ گئی رات اور دوپہر اس نے ایک کر دیا۔ کبھی اس گھر میں کبھی ان کے یہاں اور کبھی دوسرے مکان پر وہ ہر وقت مصروف ہی رہتی تھی۔ اس کے سمدھیانے سے شدید تقاضے ہونے لگے تھے اور اسے بھی جلد سے جلد یہ بار اتار دینا تھا۔ سارے گھرانوں میں بڑی بیگم کا گھر اس کو اپنا جیسا لگتا، بڑی بیگم کے گھر کا سلوک بھی اچھا ہوتا تھا۔ اور خود بڑی بیگم اسی ایک گھر اور اسی بستی میں جوان سے بوڑھی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھوں نے بہت سے تماشے دیکھے تھے۔ جس وقت وہ اپنی مخصوص آواز میں کہتیں "منیر کی بٹیا" تو اس کی آنکھیں مسرت سے چھلک پڑتیں۔ وہ سارے کام چھوڑ کر ان کے پاس بیٹھ جاتی "تمہارے اور یہ دن ہوتے" بڑی بیگم منہ میں پان رکھکر بولتیں۔ "آؤ ذرا بیٹھ کر دم لے لو" اسوقت منیر کی بیوی کے کھردرے مگر گورے گورے ہاتھ بڑی بیگم کے پاؤں دبانے لگتے۔ "بس بیگم بھابی کسی طرح طیبہ کا بیاہ ہو جائے اللہ ہی عزت رکھ لے تو"۔ بڑی بیگم کے بھتیجہ کی شادی تھی ایک مہینہ پہلے ہی سے بڑی بیگم کے بھائی خود سے آ کر ان کو جلال پور لے گئے۔

بڑی بیگم کا میکہ بہت امیر تھا، ہزاروں کی زمین داریاں تھیں اور کتنے اعلیٰ عہدوں پر کرسی نشین تھے۔ اکثر بڑی بیگم یہ کہا کرتی تھیں کہ "میرے دونوں ہاتھ بھرے ہیں ایک میں چاند اور ایک میں سورج۔ نیہر سسرال سب روشن"۔

منیر میاں کا گھر پیلی مٹی سے لیپ کر چونے سے جگہ جگہ چیت کر گلدار بنا دیا گیا تھا شام ہوتے ہی ڈھولک کی ڈھب ڈھب کے ساتھ گیتوں کی تیز جھنکار بستی بھر میں گونج جاتی۔ منیر کی بیوی نے اپنے طور پر تھوڑا بہت انتظام کرلیا تھا۔ پھر بھی بہت سے کام ابھی باقی رہ گئے تھے۔ برات کا پورا کھانا ستلی کا ایک لال جہیز کا پلنگ اور دولہا کے لئے ایک مچیا ابھی باقی رہ گیا تھا۔ مگر اب وہ ایسا محسوس کرتی جیسے راستہ چلتے چلتے اس کے پاؤں آبلوں سے چھلنی چھلنی ہو گئے ہیں۔ اس میں آگے بڑھنے کی ذرا بھی ہمت نہ تھی۔ راستہ سامنے پڑا تھا، منزل دور سے جھلک رہی تھی، اسکے پاؤں کا جیسے دم نکل چکا تھا۔ کاش اسے دو مہینے اور مل جاتے پھر جس طرح سے اس نے اتنا سامان کیا تھا۔ اتنا بھی کر لیتی، مگر اب تو گھٹا جھوم کر چھا چکی تھی وہ کر ہی کیا سکتی تھی، جب اس کا دماغ سوچتے سوچتے تھک گیا تو وہ ایک عزم کے ساتھ اٹھی۔ اسے اپنے اس پہاڑی اونچے ٹیلے والے گاؤں ہرے بھرے کھیتوں اور سنہرے پونجوں والے کھلیان پر اعتبار تھا۔ آخر یہ بکھری ہوئی کس دن اس کے کام آئیں گی۔ اس کے کانوں میں زور زور سے سیٹیاں بجنے لگیں "نہیں" "نہیں"

اس کے دل و دماغ کی کشمکش اس کا راستہ روک رہی تھی مگر وہ تیزی سے بڑی بیگم کے صدر پھاٹک کے دروازے کو آگے ڈھکیلتی ہوئی اندر چلی گئی۔ گھبرائی گھبرائی پریشان۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا۔ وہ کمرے کے اندر جھکی ہوئی سرگوشی میں آہستہ آہستہ بولی۔ "دلہن بیگم مجھے اسوقت عزت رکھنے کو ساٹھ روپے قرض دے دو۔ میں تمہارا یہ روپیہ فصل کیوقت دھان کوٹنے پر ادا کر دوں گی۔ برسات آ رہی ہے۔ بس شروع جاڑے تک مہلت دے دو۔ اور اگر جلدی ہے تو تمہارا کام کر کے چکا دوں گی۔"

"ساٹھ روپے؟" دولہن بیگم ذرا سوچنے لگیں مگر وہ رحمدل تھیں۔ دس دس روپے کے چھ نوٹ انہوں نے منیر کی بیوی کو دیتے ہوئے کہا۔ "چچی آدمیوں کی تنگی تم دیکھ رہی ہو۔ یہ روپے بھی تمہارے ہی ہیں شادی کے بعد یہاں کام کرنا شروع کر دوگی۔"

منیر کی بیوی کا سر جھکایا اس کے کندھے پر قرض کا جوا بڑا بھاری محسوس ہوا۔ مگر اس کا دل مطمئن تھا اور اسے اپنی محنت پر بھروسہ تھا۔

شادی اچھی طرح سے ہوئی۔ ساری برات اور بستی کے لوگ خوش تھے۔ منیر میاں نے نہ ہونے پر بھی اچھا دیا تھا۔ دلہن کو گود میں اٹھا کر جب رخصت کے لئے لے جایا جانے لگا اس وقت منیر کی بیوی دلہن بنی ہوئی اپنی بیٹی سے لپٹ کر پھوٹ کر رونے لگی ماں اور بیٹی ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر اس بے بسی سے رو رہی تھیں۔

جیسے کسی کو قتل کیا جا رہا ہو۔ منیر کی بیوی اب سبکدوش تھی۔ اُس نے ایک ہلکی سی موٹری اپنے کندھے پر رکھکر ایک بہت بڑا بوجھ اپنے سر پر سے اتار دیا تھا اور وہ بھی اس خوبصورتی کے ساتھ کہ عزت کی عزت رہ گئی اور یہ سب صرف ایک اکیلی عورت ذات نے اپنے بل بوتے پر کیا تھا۔

بڑی بیگم کے آتے ہی منیر کی بیوی خوشی خوشی ہنستی ہوئی وہاں پہنچی وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں کچھ لئے اسے آنچل سے چھپائے سیدھی بڑی بیگم کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ "منیر کی بٹیا مبارک ہو۔" بڑی بیگم نے پلنگ پر سے پاندان کو سرکا کر جگہ بناتے ہوئے کہا۔ "منیر کی بیوی کا آنچل زور سے پھڑ پھڑایا۔" بیگم بھابی، طیبہ کے بیاہ کا کھانا تو آپ کو نہ کھلایا بھلا ایسا نصیب کہاں تھا میرا۔ بیگم بھابی یقین مانو جی ترس ترس کے رہا ہاتھ کا نوالا حلق کے پار نہ ہوا۔ بس یہی لگے سب کوئی ہے میری بیگم بھابی ہی نہ رہیں اس گھڑی ــــ!

بڑی بیگم پان بنا رہی تھیں اگلدان میں پیک تھوک کر بولیں۔

"منیر کی بٹیا بھلا ایسی گرمی میں بھی بیاہ کرتے ہیں خالی بربادی ــ!"

"ہاں بیگم بھابی بہت ٹھیک کہہ رہی ہو میکے یہاں برات اور سرات کو کھلا پلا کر ایک دوسری دیگچی میں بھر کے پلاؤ بچ گیا صبح ہوتے ایک دم لاسا، ایسے ہی ڈوم لے گیا ــ!"

"اللہ میکے بھائی کے یہاں پچیسوں تو مرغ مُسلّم بچکر سڑتے

رہے کسی نے نظر تک نہ کی اس طرف، منوں دودھ پھٹ کر بھنکتا پڑا رہا اور میٹھے ٹکڑے تو اتنے بچ گئے تھے کہ دائی نوکر تک نے نہ پوچھا۔ گری سی گرمی۔ اللہ کی پناہ — آٹھ باورچی تو صرف پٹنہ سے آئے تھے میوہ بھری باقر خانی تک کو دیکھا نہ جاتا تھا۔ ہاں تو منیر کی بٹیا تم نے کیا کیا دیا اپنی بیٹی کو؟" — بیگم بھابی چاندی ہی کا سہی مگر دیا سب کچھ کان میں بالی گلے میں حمیل ہاتھ میں پہونچی اور بتانا اور پاؤں میں اپنا والا کڑا برتن میں دو دیگچی ایک ایک لگن دو رکابیاں ایک گلاس اور ایک لوٹا ایں بیگم بھابی اور کیا دیتی!

"ارے منیر کی بٹیا بھلا تم بچاری کے یہاں کا بھی بیاہ —! میرے بھتیجہ کو برتن ملے ہیں، یہ یہ تو لگن ہیں" بڑی بیگم نے اپنے دونوں ہاتھوں کو انتہا تک پھیلاتے ہوئے کہا۔" اور دیگ ہیں، بس یہی سمجھو کہ آدھے کنوئیں ہیں وہ، میرے باپ کا اتنا بڑا مکان جیسے بھر گیا جہیز سے، اور سونے کا زیور ملا ہے جی! یہ یہ موٹا! وزنی وزنی، دلہن سر سے پیر تک سونے کے گہنے سے پٹی ہوئی تھی۔ کڑے، چھڑے پازیب تک سونے کے، ایسے جیسے آگ دہک رہی ہو۔ اور پھر تم بیچاری کیا دیتیں جہیز جو دیا بہت دیا۔" منیر کی بیوی کے آنچل کے اندر سے قیں قیں کی آواز سن کر بڑی بیگم چونک پڑیں "یہ کیا ہے منیر کی بٹیا تمہارے ہاتھ میں —؟"

"یہ — یہ بیگم بھابی تمہارے لئے تو لائی ہوں تھوڑا گھی

باسمتی اور یہ مرغی ——" اس نے آنچل ہٹا کر بغل میں دبی ہوئی مرغی کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "سب لوگوں کو تو کھِلا چکی، بس ایک تم ہی باقی رہ گئی ہو بیگم بھابی اسی لئے یہ لائی ہوں کہ اپنی باورچن سے ذرا اچھی طرح سے پکوالو میں خود سے پنکھا جھل جھل کر تمہیں کھلاؤں گی۔ بیگم بھابی —— طیبہ کے بیاہ کا یہ کھانا ہے نا۔" منیر کی بیوی کے لب بولتے ہوئے کانپ رہے تھے۔

"ارے تم۔ بیچاری کیا کھلاؤ گی کھانا۔ رہتے تو سب کے ساتھ ہم بھی کھا لیتے اب یہ خاص کر کے اتنا خرچ اخرچ کرنا —— پاگل ہو گئی ہو —— رکھ دو جا کے یہی سب کام آوے گا داماد کے آنے پر —— بھلا کہاں سے لاؤ گی تم بیچاری —— !" بڑی بیگم نے پھر ذرا آہستہ سے کہا: "ہاں منیر کی بٹیا تم تو آؤ گی نہ دلہن کے پاس ؟"

منیر کی بیوی نے دائی گیری کبھی نہ کی تھی۔ آزادانہ مزدوریاں کر کے گزارہ کرتی جا رہی تھی۔ دلہن بیگم سے تو اس نے اپنے وقت پڑنے پر جوشش کلام میں کھانا پکانے کا وعدہ کر دیا تھا۔ دائی لونڈی کے کام سے اس کے پندار کو ٹھیس لگتی تھی۔ پنچ کام —— بڑی بیگم کی یہ آخری بات سن کر جیسے وہ کوئی ہولناک خواب دیکھتے دیکھتے یک بیک بیدار ہو گئی تھی اور اس کی بیداری خواب سے بھی زیادہ تلخ تھی —— ! مہینوں کی انتھک محنتوں کے بعد اچانک طور پر اس کا بند بند ٹوٹنے لگا تھا۔ وہ تھکی ہوئی شکست خوردہ دیوار سے لگی کھڑی تھی، اُسکا

سر چکرا رہا تھا، پلنگ پر سامنے ایک رکابی میں پاؤ بھر باسمتی اور ایک چھوٹے سے پیالے کے پیندے سے لگا ہوا تھوڑا سا گھی پڑا تھا اور اس کے پسینے سے شرابور بغل میں سمٹی ہوئی مرغی اس سے اور زیادہ دبک کر سمٹ گئی تھی۔ کھڑے کھڑے اُس کے پیر کانپ رہے تھے۔ اُس کو اِس بچاری کے نام سے شدید نفرت تھی۔ اس مجبور اور اپاہج نام سے اِسے گِھن لگتی تھی۔ اور وہ اپنی محنتوں کے بل بوتے پر اپنے کو اس بے بس نام سے بلند سمجھے ہوئے تھی —— ”بیچاری —— ”بیچاری“ کی آواز دل کے تیز دھک کے ساتھ اس کے دماغ پر ہتھوڑے لگا رہی تھی۔

اس کی پرُنم نگاہوں کے آگے ”بیچاری“۔ ”بیچاری“ کے لفظ سے بھرے ہوئے دس دس روپے کے چھ نوٹ کٹے ہوئے پتنگ کی طرح فضا میں بے تھاہ ڈگمگا رہے تھے!

صدائے واپسیں

"لے آلو! لے پلول! لے ساگ، توریں، کریلا جھینگی! لے بینگن لے ترکاری!"۔ ہوا کی طوفانی سنسناہٹ اور پانی کے شور کے ساتھ تھرتھراتی ہوئی یہ مسلسل آواز گلیوں سے آرہی تھی۔ تیز ہواؤں کے ساتھ زور سے پانی برس رہا تھا۔ اور کپکپا دینے والی سردی سے بدن کی ہڈیاں اکڑی جارہی تھیں۔ سڑک سنسان پڑی تھی دوکانوں پر ٹاٹ کے پردے اور جالی دار ٹھٹھریاں ڈالدی گئی تھی۔ سامنے ہر لمحہ گردش کرتی ہوئی دنیا کی طرح چکر لگاتا ہوا کولہو تک خالی پڑا تھا اور اس کا مَریَل سا بیل دھوبی کے لاغر گدھے کے ساتھ ساتھ گلی کی دیوار سے لگا دبکا کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی پکوڑیوں والے گندے

حلوائی کا گھنونا مرتوکا باسا کتا اپنے مالک کے سرد چولھے کے اوپر منہ کو پیٹ میں چھپائے بےخبر سو رہا تھا۔ ایسی خاموش فضا میں مجھے محسوس ہوا جیسے دنیا بھی گردش کرتے کرتے اپنے محور پر تھک کر سو گئی ہے صرف آسمان اور کرۂ ہوا بیدار تھا۔

بارش اور زور سے ہونے لگی تھی میں نے باورچی کو پکار کر کہا "آج مسور کی خوب دال دی ہوئی پتلی کھچڑی پکانا آلو کا بھرتا۔ مرچ کی چٹنی، گھی بریانی کیا ہوا اور انڈے کا املیٹ بنا دوگے سمجھے؟ اب کہاں ایسے پانی میں بازار کرنے مارے پھروگے"۔ دروازے کے اندر داخل ہوتی ہوئی ایک تیز آواز میرے سامنے گونجی "ترکاری لیا جائی"؟ "آلو ہے توریں ہے۔ ساگ پیاج۔ بیگن۔ نیموں۔ جو کھو جو"۔ ایک ترکاری والی بڑھیا پانی سے شرابور کانپ رہی تھی اور نمایاں طور پر اسکی سوکھی ہوئی گردن بوجھ کے احساس سے بار بار ہلتی جا رہی تھی۔ لیکن۔ اس کی تھرتھراتی ہوئی آواز میں ایک رعونت تھی اور پھولی ہوئی بیمار جھریوں کے اندر دھنسی ہوئی آنکھیں میلے تاگے سے جا بجا بندھی ہوئی داغدار عینک کے اندر فاتحانہ طور پر چمک رہی تھیں۔

اس نے اپنے سر پر رکھی ہوئی ٹوکری کو بڑی مشکلوں سے گردن کو کئی کئی طرح سے سوداگرانہ جنبش دے دے کر باورچی کی مدد سے اتارا بھیگے ہوئے میلے کپڑے سے ڈھکی ہوئی ٹوکری سے گردہ اپنے سامنے بیٹھ گئی۔ ہاں بولو تو کون سی ترکاری؟ کتنا کتنا؟ اس نے

ٹوکری کے اوپر سے بانس کا ترازو ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ باورچی اس کے پاس برتن رکھتے ہوئے بولا "ارے پہلے بھاؤ تو بتاؤ۔ کتنے کتنے سیر بھاؤ؟ بھاؤ کا آج بنا ہے؟ چھ آنے آلو۔ پانچ آنے توریں۔ بارہ آنے پلول۔ آٹھ آنے پیاج دو دو آنے نیموں"۔ باورچی حیرت سے منہ پھاڑ کر کہنے لگا "کا بڑھیا آج لوٹے آئی ہے بھلا اتنا مہنگا بھی ترکاری ہے کہیں؟" بڑھیا نے وقت کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے اپنے ہاتھ کا ترازو ٹوکری میں رکھکر کہا کہ تب جاؤ جہاں سستا ہو وہیں سے لے لینا۔

مگر باورچی کو غرض تھی اور وہ پانی اور سردی سے بچتے ہوئے بھی گھر بیٹھے ٹھیک داموں میں ترکاری لینی چاہتا تھا۔ اور شاید بڑھیا بھی اس کڑکڑاتی ہوئی سردی میں اپنے سر پہ کا بوجھ ہلکا کر دینا چاہتی تھی۔ اس نے دوبارہ ترازو اٹھا کر پوچھا کہ کتنا کتنا سیر اور کیا کیا ترکاری لینی ہے۔

اسنے بڑے اہتمام سے ٹوکری پر سے اس طرح کپڑا ہٹایا جیسے نئی دلہن کی رونمائی ہو رہی ہے۔ ساری ٹوکری لال ساگ سے بھری ہوئی تھی اور اس کے علاوہ ٹوکری کے حاشیے پر گرداگرد بھٹے یوں آراستہ کر کے کھڑے کئے گئے تھے جیسے گل مچھے والے سپاہی کسی ہری بھری دولت کی حفاظت کر رہے ہوں۔

"کیا بڑھیا آج خالی ساگ ہی بھر کے لائی ہے"؟ وہ زور

سے کہنے لگا۔ ارے سب ہٹ جی سب۔ بڑھیا اندر سے ترکاری نکالتے ہوئے خوشامدانہ ہنسی ہنستی ہوئی بولی۔ اس کی رعونت ختم ہو کر اب مترحمانہ صورت اختیار کر گئی تھی۔ "بڑا پانی ہوا ہے بیٹا۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر اسے تول رہی تھی جیسے کوئی ملزم سزا ملنے سے پہلے کی ایک ایک گھڑی کو غنیمت سمجھتا ہو۔ "آج تو ہاٹ نہ ٹھکانے سے لگا" ترازو کے ایک باڑے پر موٹی موٹی توریں جھولتی ہوئی کبھی اوپر کبھی نیچے جا رہی تھی۔ "ہاں بیٹا لو آدھ سیر توریں۔ بڑی کنکنی ہے اچھا کئے بیٹا ہاٹ نہ گئے جان ہے تو جہان اور ای لو پاؤ بھر بلول۔"

باورچی تھوڑی سی ترکاری دیکھتے ہی جھلا گیا تھا۔ اس نے موٹی موٹی توریں کو واپس کرتے ہوئے کہا کہ وہ اتنی خراب باسی اور سنائی ہوئی ترکاری نہ لے گا۔ "نہ نہ کہاں تریں سنائی ہوئی ہے" بڑھیا موٹی موٹی تریں کو بیچ سے توڑتی ہوئی بولی۔ "بلا سے نا ہے مگر ہم دوسرا لینگے۔" باورچی ساگ کو ترکاری پر سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ بڑھیا تڑپتی ہوئی زور سے چیخ اٹھی "دیکھو دیکھو ہاتھ نہ لگاؤ ہری سب ترکاری مل جل جے رہے!" مگر باورچی نے سب ساگ کو ترکاری پر سے ہٹا کے جیسے بڑھیا کے چہرہ پر سے نقاب اٹھا کر اس کی جھریوں کو اور نمایاں کر دیا تھا۔

ٹوکری گویا خالی پڑی تھی صرف اس کے پیندے پر تھوڑی تھوڑی ہر قسم کی ترکاری چھترائی ہوئی تھی۔ مجھے یہ پر مذاق سین دیکھ کر

ہنسی آگئی۔

برتن میں لی ہوئی ترکاری کو بڑھیا کی ٹوکری میں پھینکتے ہوئے باورچی بکنے لگا کہ بڑی ترکاری بیچنے چلی ہے۔ پاؤ بھر پلول، سیر بھر تریں لے کر کنجڑن بنی پھرتی ہے۔ جھوٹ موٹ میں اس نے اتنی دیر سے اسے الجھائے رکھا تھا۔ اور مول جول تو ایسے کر رہی تھی جیسے اپنے باوا کے کھیت سے من من بھر ترکاری توڑ کر لائی ہے

شکست خوردہ اور مترحمانہ نظروں سے میری طرف دیکھتی ہوئی بڑھیا رو پڑی "بہت گریب ہیں بابو بہت گریب" اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں کی مٹیالی پتلیاں آنسو میں تیر رہی تھیں اور اس کے لبوں کے گوشوں کی لمبی لمبی جھریوں کی لکیروں میں رال تیر رہی تھی۔ مسوڑھوں کی بندشوں سے آزاد ہوتے ہوئے لمبے لمبے پیلے دانت بولنے میں ابھر ابھر آتے تھے وہ اپنی کہانی سناتی گئی اپنے طبقے کی طرح وہی ایک پلاٹ والی سادہ سی کہانی۔ وہ تین نوجوان بیٹوں کی ماں تھی اور اس کے اپنے کھیتوں میں کبھی ترکاریاں لہلہاتی تھیں زلزلہ میں اس کا ایک بیٹا دب کر رہ گیا اور دو ملیریا سے ختم ہو گئے۔ جب کھیت کے بیل ہی نہ رہے تھے تو کھیت کیسے رہتا اور اب اس کے دکھوں کی شریک حال ایک دکھیاری بیٹی رہ گئی تھی جو جنم ہی سے روگ لے کر آئی تھی اور اب اسے طحال اور جگر نے ادھ موا کر دیا تھا۔ اتنی شدید سردی اور ایسے پانی میں وہ صرف اس لئے قرض لے کر ترکاری بیچنے کو نکلی تھی کہ قرض میں سود واپس

کر کے کچھ آنے اس کے پاس بچ رہیں گے جس سے وہ اپنی بیٹی کی دوا لا سکے گی۔

ایک لمحہ کے لیئے وہ چپ ہو گئی۔ اس کی نگاہیں نجانے کیوں آسمان پر چھائی ہوئی بدلیوں پر جم کر رہ گئیں۔ اور میں اس کے جھریوں والے بیمار چہرے کو دیکھتی رہی جہاں سے آنسوؤں کی دھاریاں بہتی ہوئی اس کے بھیگے ہوئے آنچل میں جذب ہو رہی تھیں۔

اس نے بڑی لجاجت سے کہا، "کچھ بھی لے لو بیٹی"۔ میں ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھی۔ ترکایوں پر بڑھیا کے آنسو ابھی تک چمک رہے تھے۔ باورچی دوسری طرف سے آ کر بڑھیا کو دیکھتے ہوئے بولا "جا۔ جا ابھی تک بیٹھی ہوئی ہے۔ نام گنا دے کو سوٹھو، پلول لو، آلو لو، جھبوٹی۔ آخر کا سمجھے ہے بڑھیا کہ نام گنا دے سے ٹوکری بھر جاگی؟!"

اس کو کیا معلوم تھا کہ نام لینے سے ٹوکری کبھی بھر بھی جاتی ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اس کے پاس صرف نام ہی نام تو رہ جاتا ہے اور یہی اس کا سب کچھ ہوتا ہے، اگر آج وہ ان ناموں کو بھی بھول جائیں تو پھر اس دنیا میں ان کا کیا باقی رہے گا؟۔ کھوکھلے نام اور ابھر آنے والے "کل" کا انتظار ہی تو انکی زندگی کا سہارا ہے۔ دنیا بھر کی ترکاریوں کے نام کی صدا لگا کر کون جانے کہ وہ اپنی حسرتوں کو فریب دیتی تھی یا گاہکوں کو۔ ایک ہی سانس میں اتنے ناموں کو گنتے ہوئے وہ ایک لطیف سا خواب دیکھنے لگتی جہاں ترکاریوں کی رنگ

برنگی قوس و قزح میں اس کے ارمانوں کی دنیا شاداب نظر آتی ہوگی، وقتی طور پر ہی سہی، وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے کو ایک کامیاب بیوپاری تو سمجھ لیتی تھی۔ تاجرانہ فریب۔ سبھی تاجر ایسا کرتے ہیں۔ شاید فریب بڑا ہو کر فریب نہیں رہتا اسی لئے بڑے جھوٹوں کی پکڑ نہیں ہوتی۔

بڑھیا مجھ سے پھر کہنے لگی "کچھ بھی لے لو بیٹی" مگر میں نے اپنے ضمیر کی سرگوشیوں کو خاموش کر دینے کے لئے وہاں پر سے اٹھ کر جاتے ہوئے کہا "کل لونگی بڑھیا ضرور لونگی"۔ مجھے بڑھیا کی سڑسڑاتی ہوئی ناک اور بہتی ہوئی آنکھوں سے پھر گھن آنے لگی تھی۔ جانے کہاں کہاں ان ترکاریوں میں کتنے آنسو جذب ہو چکے ہونگے۔

وہ چپ چاپ ساگ کو پھر ترکاریوں پر بچھاتی ہوئی اپنی کانپتی انگلیوں سے ٹوکری کو بڑی آسانی سے سر پر رکھکر باہر نکل گئی۔ تیز ہوا اندر آرہی تھی، میں جب اٹھ کر دریچے کے شیشوں کو بند کرنے لگی تو گلی میں سے پانی کے شور کے ساتھ ساتھ تھرتھراتی ہوئی مگر زور دار آواز آرہی تھی۔

لے آلو۔ لے پٹول۔ لے ساگ توریں۔ لے بیگن کریلا، لے سبھی ترکاری"

سوکھا ہوا پودا

یہ روپے کا جب سے سوا سیر چاول ہوا تھا اُس نے نہ تو پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا اور نہ بھوک سے رات بھر وہ اچھی طرح سویا ہی تھا۔ روکھے پھیکے دو ایک نوالے جب وہ اپنے حلق سے نگلنے لگتا تو تلی کے بدبودار تیل کی مہک سے جیسے اس کا دماغ پھٹ جاتا، اور اس گرانی کو یاد کر کے اس کی روح گھلنے لگتی، وہ جتنا کھاتا نہیں اس سے زیادہ روز روز کی فکر خود اس کی زندگی کو کھاتی جا رہی تھی۔ اس کے رکشے کے ہر ایک ٹوٹے ہوئے چول کی طرح اس کی پسلی اور ریڑھ کی ہڈیاں گلے کے کنٹھ مالے اور ہنسلیاں اور دگدگی اس کے بھورے چمڑے کے اندر

سانس لینے میں ایک دوسرے سے ٹکراٹکرا سی جاتیں۔ اس کا چہرہ سوکھے ہوئے لیموں کی طرح ہر طرف سے پچک گیا تھا اور چہرے کی ہڈیاں نمایاں ہوگئی تھیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کو کیا ہوگیا ہے، لیکن سارا سارا دن رکشا چلاتے چلاتے تھک کر نڈھال جب وہ سونے لگتا تو اس کے تلوے اور ہتھیلیاں بڑی طرح جلتی رہتیں؛ اور اس کا کرتا باوجود سردی کے پسینے سے تر رہتا تو اُسے خیال ہوتا، شاید وہ بیمار ہو رہا ہے! اور وہ ہر روز سوچتا کہ حکیم جی کی پڑیا یا کوئی مصفّی کھا لے گا لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے اپنا رکشا یاد آجاتا۔ جس کے چول کی مرمت زندگی کے للچاتے ہوئے چولوں سے کہیں زیادہ اہم تھی؛

صبح سے دوپہر تک کا وقت اس کے لئے بڑا منحوس گذرا تھا اور اس کو یقین تھا کہ سویرے سویرے اس نے اپنا شگون خود ہی سے بگاڑ لیا تھا مگر وہ کیا کرتا؟ اتنے تھوڑے سے کرائے پر وہ کیسے خاموش رہتا۔ آخر وہ بھی تو انسان تھا اور اسے بھی کسی نہ کسی طرح جینا ہی تھا۔ مگر اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ کسی سے نہ تو بگڑ کر بولیگا اور نہ جھگڑا ہی کرے گا۔ اس کا خیال تھا کہ دل دکھا کر سکھ نہیں ہوتا۔ مگر اس کے دل میں جیسے کوئی آہستہ سے کہتا،

"تیرے سینے میں بھی تو دل ہے پھر لوگ تیرا خیال کیوں نہیں کرتے۔؟"

سڑک کے ایک کنارے وہ اپنے رکشا کے گدے پر بیٹھا ہوا

سوچتے سوچتے ہنس پڑا" اور جب کرایہ مانگو تو اکثر یہی ہوتا ہے کہ کتّے بھونکتے ہیں، نوکر ڈانٹتے ہیں اور احاطے کے پھاٹک بند کر دیئے جاتے ہیں"۔۔۔! بیچاری غریب سواریاں وہ تو اپنی ہی ہیں اگر وہ بھی درد کو درد نہ سمجھیں تو پھر کیا ہے؟۔۔۔!

صبح سے چار بجے تک اس کی جیب میں آج کی کمائی کُل آٹھ آنے پیسے تھے! اور چار سبز لال بھورے رنگ کے ایک آنے اور دو اور ایک پیسے والے ٹکٹ۔ اسے ان ٹکڑوں سے بڑی نفرت تھی کمبخت کی نایابی کے ساتھ وہ بڑی مشکلوں سے ٹکٹ لیتا۔ اکنّی دوّنی اور پیسے دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں جنم سے عادی ہو چکی تھیں مگر اسے ٹکڑوں کے دام ذرا بھی معلوم نہ تھے کہ یہ کتنے کے ہیں۔ بہت سمجھانے پر اس نے رنگوں کو یاد کر لیا تھا کہ اس رنگ کی قیمت کیا ہے اور اس رنگ کا ٹکٹ کتنے کا ہوگا؟ مگر سب سے بڑی دقت تو یہ تھی کہ برسات کی مرطوب ہوا سے اس کے جیب میں پڑے ہوئے ٹکٹ ایک دوسرے سے چپک کر عجیب طرح کے ہو جاتے جنہیں بڑی مشکلوں سے وہ بیٹھا بیٹھا الگ کرتا رہتا۔

وہ اپنے نزدیک کی آواز سُن کر چونک پڑا۔ جب سے ہاتھ پاؤں میں جلن رہنے لگی تھی اس کا دماغ عجیب طور سے سنسناتا رہتا اور اس کے کانوں میں ہر گھڑی رکشے کی گھنٹیوں کی تحلیل ہوتی ہوئی مدھم گونج کی طرح سیٹیاں سی بجتی رہتیں۔ اس نے کسی طرح کا

مول جول کئے بغیر بتائے ہوئے راستے پر اپنا رکشا موڑ لیا۔ اس کو بخار سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی طبیعت گری گری لگ رہی تھی اور اس کا منہ نیم کی طرح کڑوا تھا۔ اس نے اپنے حلق کے آخری سرے سے سوکھی ہوئی گردن کو اوپر کھینچتے ہوئے کھنکھار کر چھین بھر رسدار تھوک پھینکتے ہوئے اپنا رکشا ٹھرا لیا۔

اسے ڈاکٹر کے یہاں جانا تھا کسی مریض کو دکھانے کیلئے جب وہ جانے لگا تو رہ رہ کر اس کے دل میں یہی خیال آ رہا تھا کہ ان دونوں میں بیمار کونسا ہوگا؟۔ اسے ہر بات کریدنے کی لت تھی۔ وہ رکشا چلانے والے اور ٹمٹم میں جوتے ہوئے ٹٹوؤں میں بہت بڑا فرق محسوس کرتا تھا، اس کے پیر پیڈل چلاتے، ہاتھ ہنڈل اور برک پر رہتا، مگر دماغ — وہ اپنے پیچھے گدّے پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے متعلق اکثر سوچتا رہتا۔ اور اس وقت بھی وہ اپنے سوکھے پیروں سے آہستہ آہستہ پیڈل چلاتا ہوا یہی سوچ رہا تھا کہ ان میں مریض کونسا ہوگا“؟ ”کیا دونوں؟“ ریشمی لتری چادر کے خاکستری رنگ میں لپٹا ہوا تندرست جسم دمک رہا تھا اور سفید سلکن کرتے میں وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کوئی مریض ہو سکتا ہے۔

اسے بار بار تیز چلنے کی تاکید کے ساتھ ساتھ ڈانٹ پڑنے لگی تھی۔ جس طرح ہر چابک پر مریل گھوڑا بھی کچھ دیر کے لئے سارا زور لگا کر آگے بڑھنا چاہتا ہے، اسی طرح وہ بھی انتہائی کوشش کرنے لگا

کہ گھڑی گھڑی گولیوں کی طرح سنسناتی، قلب و جگر کو چیرتی ہوئی یہ ڈانٹیں اسے نہ سننا پڑیں۔ اس کے سوکھے ہوئے پیروں کی اُبھری اُبھری انگلیاں پیڈل پر اپنا سارا زور لگا کر بھی اُسے تیز نہ کر سکیں۔ اس کے جسم کی اُبھری ہوئی ہڈیاں اپنا سارا زور لگانے میں جھولنے لگیں وہ پسینے سے تر ہو جاتا ہے اور رکشے کا ہر مجروح پرزہ چرچرانے لگتا۔ مگر رکشا اپنی معمولی رفتار سے آگے نہ بڑھ سکتا تھا۔ وہ رکشے کے گدے پر سے ایک سخت ڈانٹ سن کر جھلّا گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ جواب دینا چاہتا تھا۔ مگر اس کے لب خاموش رہے۔ اس سے کچھ بولا نہ گیا۔ اس کی نگاہیں دم بھر کے لئے آدھی کی دھوتی سے پھسلتی ہوئی تندرست موٹی اور گٹھیلی پنڈلیوں پر گئیں۔ اس نے رکشا کو زور سے آگے کی طرف کھینچتے ہوئے اپنی انگلیوں کے ساتھ تانت کی طرح تنے ہوئے پٹھوں کو دیکھا اور پھر اپنے گھٹنوں کی گول گول اُبھری ہوئی مردوں کی طرح ہڈیوں کو بھیانک طور پر آگے پیچھے جاتے ہوئے دیکھکر سوچنے لگا "کاش اس کی پنڈلیاں بھی ویسی ہی ہوتیں موٹی موٹی سی" — اس کا رکشا ڈھلوان پر سے تیزی سے اترنے لگا۔ اسے اپنے رکشے کی یہ رفتار ہی بڑی اچھی لگی۔ اسے محسوس ہوا جیسے ہمیشہ سے اسکا رکشا ہوا کیطرح چلتا رہا ہے۔ اس کے سوکھے سوکھے پاؤں کی پنڈلیاں تندرست اور گٹھی ہوئی ہیں اور رکشے کے لپلپاتے ہوئے چول سُرخ بھاپ نکلتے ہوئے گرم گرم گوشت

کے لوتھڑوں سے بڑھے ہوئے تیزی سے چل رہے ہیں۔

اسے کئی پھیرے دیکر ڈاکٹر کی کوٹھی پر جانا پڑا۔ جگہ جگہ اس کا رکشا رکتا رہا۔ کبھی چین اتر گئی کبھی اونچی سڑک پر وہ اپنے ہاتھوں سے اسے کھینچتا ہوا لے گیا۔ جب اس نے شہر کے ایک بہت بڑے ڈاکٹر کی کوٹھی پر اپنے رکشے کا بریک روکا تو وہ تھک کر نڈھال ہو گیا تھا۔ اپنے جانگھیے کی جیب سے اس نے ایک میلا سا رومال نکال کر پسینے سے تر اپنا ہاتھ پونچھا۔ اس کے چہرے کی ابھری ہوئی ہڈیوں سے لپٹے ہوئے ڈھیلے ڈھالے مٹیالے زرد چمڑے پر دہکتے ہوئے تانبے کی سی سرخ تمتماہٹ تھوڑی دیر کے لئے جوانی کا تناؤ اور صحت کا کھویا ہوا رنگ سا ابھر گئی۔

وہ مریض اور اس کے ساتھی جب کوٹھی کے اندر چلے گئے تو وہ تھکا ہوا پریشان اپنے رکشے کے پہیے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ پسینہ اب بھی اس کے مساموں سے نکل رہا تھا، اسکی دونوں ہتھیلیاں ٹھنڈی ہو رہی تھیں اور پیروں کے تلوے جیسے شل ہوئے جا رہے تھے۔ سوکھی کھانسی اس کے حلق میں اٹکی ہوئی تھی اور وہ بمشکل سانس لیتا ہوا کھانسنے لگا۔ اسکی کھانسی بڑھتی گئی اور وہ اپنے ہاتھوں سے سینہ کو دبائے بڑی طرح کھانستا رہا۔ جب اس کی کھانسی رکی تو اس نے اپنی طرف بہت سے لوگوں کو متوجہ دیکھا جس میں سے اکثر تو وہ مریض تھے جو بنچوں اور کرسیوں پر ایک کنارے بیٹھے

اپنے بلائے جانے کا انتظار کر رہے تھے اور کچھ اسی کوٹھی کے خدمتگار بھی تھے۔ ڈاکٹر کا موٹر ڈرائیور ہر آنے جانے مریض پر بڑا مہربان تھا۔ ایک وقت میں کسی سے حالات دریافت کرکے ہمدردیاں بھی کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ کسی کو بڑے اپنائیت اور محبت سے دوا کھانے کے طریقے، آرام کرنے کی ضرورت اور زندگی کی اہمیت کو سمجھا رہا تھا، اس کے گرد بھی ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ کھانسی کی تیز آواز سے لوگ چونک پڑے تھے۔ مہربان ڈرائیور نزدیک جاکر اس کی کھانسی رکتے ہی بولا "تمہیں بڑی بڑی کھانسی ہو رہی ہے ابھی سے خیال رکھو اتنے ہی سے کیا سے کیا ہو جاتا ہے اور دیکھتے ہو کیسی کھوکھلی کھانسی ہے تمہاری؟ اپنا خیال کرو میاں۔ جوان جہان ہو پیسہ بٹورنے پر مت جاؤ۔ بیوی بچے ہیں نہ تمہارے۔ کیسے ہلدی کی طرح پیلے ہو رہے ہو۔ جیو میاں جیو" وہ ابھی تک کھانسی سے بیدم ہوکر مشکلوں سے سانس لے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے حلقوں میں پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے جمع ہو گئے تھے۔ اسنے بس سر اٹھا کر اسے دیکھا اور بہت دیر تک اسکی نگاہیں اسی طرف جمی رہ گئیں، ساکت، خاموش ظاہراً سامنے دیکھتی ہوئی آنکھیں کھلی تھیں مگر اس نزدیکی سے وہ بہت دور دیکھ رہی تھیں۔ زندگی کے ٹیڑھے ترچھے راستے، کہیں ٹیلے کہیں کھائیاں، ان دشوار گذار راستوں پر اسطرح پسینے پسینے ہوکر ٹھنڈی ٹھنڈی انگلیوں سے زندگی کی ٹوٹی پھوٹی ملگجائی ہوئی ہنڈل کو پکڑے کون کھینچتا ہے؟ جینے کی تمنّا؟ یا کششِ حیات؟ مگر ان راستوں سے

ہوتے ہوئے اس کی منزل کہاں تھی ۔؟ وہ کہاں جا رہا تھا۔ موت کی طرف؟ اس خیال کے آتے ہی وہ چونک پڑا۔ اس نے محسوس کیا جیسے شاید وہ سو گیا تھا شام کے سناٹے میں اس کا جی گھبرایا گھبرایا سا لگ رہا تھا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی زرد روشنی میں اس کو زمین، آسمان، درخت، مکان، دنیا کی ساری چیزیں ہلدی کی طرح پیلی، بیماریوں میں لپٹی زور زور سے کھانستی سسکتی، تھکی اور بیدم سی لگ رہی تھیں۔ اسے ڈرائیور کی باتیں یاد آئیں اس نے مریضوں کیطرف حسرت سے دیکھا۔ "کتنے لوگ بیٹھے ہیں۔ اگر ان لوگوں میں ایک وہ بھی ہوتا تو کیا ہو جاتا شاید لوگ اسے ساتھ نہ بٹھاتے۔ بلا سے وہ زمین پر ہی بیٹھ جاتا۔ مگر اس کی یہ کھانسی، ہاتھ پاؤں کا جلن، ابھری ہوئی یہ بھیانک ہڈیاں اور منہ کا اتنا تیتا مزہ یہ سب تو ختم ہو جاتا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ بہت بیمار ہے اور کھانسی! ابھی اس نے سنا تھا کہ کھوکھلی کھانسی بڑی بری ہوتی ہے۔ اگر کبھی اسے بھی ڈاکٹر صاحب دیکھ لیتے تو پھر وہ اچھا ہو جاتا۔ ایک تندرست انسان رکشا پر بیٹھے ہوئے مریض کی طرح اس کی پنڈلیاں بھی موٹی موٹی ہو جاتیں۔ اسے زور کی پیاس لگ رہی تھی۔ اس کا حلق سوکھا جا رہا تھا۔ کوئیں کا صاف پانی اس کی آنکھوں کے آگے جھلک رہا تھا۔ مگر اس کے ہاتھ میں کچھ نہ تھا۔ نہ بالٹی تھی اور نہ ڈوری۔ سوچتے سوچتے اس کا جی ڈوبنے لگا کیسے مریض ہیں یہ کتنی دیر لگائیں گے۔" مالی پودوں میں جھرنے

سے پانی دے رہا تھا۔ وہ ایک طرح سے برابر کٹے ہوئے گانسوں کو دیکھنے لگا۔ اچھا یہ لگ رہا ہے"۔ اور ہر طرح کے پھولوں کو دیکھ کر اسے بڑا سکون محسوس ہوا سارے پھول لہلہا رہے تھے۔ جوہی، بیلے، کامنی، گل مہندی اور جسمیں سبھی طرح کے پھول کھلے تھے، مگر اس نے ان شاداب پودوں کے درمیاں ایک سوکھتا ہوا گلاب بھی دیکھ ہی لیا۔ اسے مالی پر بڑا غصہ آ رہا تھا جو سارے پھولوں میں پانی دیتا ہوا بے پروائی سے اس سوکھتے ہوئے گلاب کو نظر انداز کر کے آگے نکل گیا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ مالی کے ہاتھوں سے پانی کا جھرنا چھین کر اس سوکھتے ہوئے گلاب کی جڑوں میں اتنا پانی دے کہ ان ہڈیوں کی طرح سوکھتی ہوئی شاخوں میں سے سرخ رنگ کی نرم و نازک لپٹی ہوئی پتیاں نکلنے لگیں اس نے ادھر سے منہ پھیر کر زور سے ٹھنڈی سانس لی۔ اس کی نظر پھٹے ہوئے کرتے سے ہوتی ہوئی اپنی پسلی کی ابھری ابھری ہڈیوں پر گئی۔ گلاب کی سوکھی ہوئی شاخیں دور تک اس کے پنجڑے کے اندر پھیلی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہوئے اسے یکایک محسوس ہوا جیسے اس کی پسلیوں میں سے نئی نئی تہہ بتہہ! نازک نازک کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔

اس کی سواری واپس آ کر رکشے پر بیٹھ گئی تھی، مگر وہ اسی طرح خاموش رکشے سے لگا بیٹھا رہا جیسے اسے کسی بہت ہی اہم مریض کو دکھانا باقی رہ گیا ہے اور وہ اس کے آنے کا منتظر ہے

اور جب اس نے کئی پکار پر اپنا رکشا ڈاکٹر کے مکان سے واپس موڑا تو پھاٹک تک پہونچتے ہی اس کے رکشے کی چین اُتر گئی۔ چین چڑھاتے ہوئے اسے خیال آیا کہ اسے کچھ کرنا ہے۔ اور وہ کوئی چیز بھول گیا ہے مگر اسے کوئی بات یاد نہ آئی اور جب وہ سڑک کے اچھے راستے پر آیا تو وہ اپنے دماغ سے ساری باتوں کو بھلا دینے کے لئے زور زور سے اپنا رکشا چلانے لگا۔ ہر طرف جھولتا چھالتا لچ لچ کرتا بہت سی چرمر آوازوں کے ساتھ وہ اپنے رکشا کو تیزی سے چلا رہا تھا اس کے ہاتھ اور پاؤں تھک گئے تھے اور اس کا دماغ گھومتا ہوا الگ رہا تھا۔ اس کے کانوں میں ڈرائیور کی آواز گونج رہی تھی۔ "جیو میاں جیو" ہاں وہ ضرور جیئے گا مگر وہ کیسے زندہ رہے گا آخر اس کے دماغ میں ایک ہل چل سی مچی ہوئی تھی اور اس کشمکش سے نکلنے کے لئے وہ انتہائی محنت اور تیزی سے اپنا رکشا چلائے بھاگا جا رہا تھا۔ یک بیک گندی گالیوں کے ساتھ تیز ڈانٹ سُن کر اس کے گھومتے ہوئے پیر رک گئے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے بجلی کی روشنی میں ڈاکٹر کی جگمگاتی ہوئی وہی کوٹھی تھی۔ وہ کئی پھیر کئی چکر لگا کر پھر وہیں آ پہنچا تھا جہاں سے چلا تھا۔ وہ تھک کر ہانپ رہا تھا۔ اس نے رکشے کی اترے ہوئے چین کی طرف

بے پروائی سے ایک نظر ڈالی اور باہر سڑک کی طرف پھاٹک کی ستون سے لگ کر وہ ریشمی خاکستری چادر اور سفید سلکن کرتے کو نظروں سے اوجھل ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔

کیڑے

سڑک کے ایک کنارے کوڑوں کے ڈھیر میں پتھر کوئلے کی سفید سفید راکھ سے اپنے دونوں ہاتھ اُجلے کیۓ ہوئے ’مُنیا‘ زور سے ہنس پڑی ”ہی ہی ہی“ - ارے بھیّا دیکھ رے، میرے ای ملا“ اس کی پتلی پتلی، راکھ میں لتھڑی ہوئی انگلیوں میں ایک ٹوٹی ہوئی گڑیا تھی، جسے وہ بڑے شوق اور پیار سے الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی ـــ اور اس کا بھیّا بیچ سڑک پر کئی لونڈوں کیساتھ بہت انہماک سے گولیاں کھیلتا کھیلتا کبھی کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ مُنیا کے قریب ہی بیٹھی ہوئی اس کی ننھی سی بہن اپنی مٹھی میں کوڑے پر سے راکھ اٹھا اٹھا کر اپنے منہ میں ڈالتی جا رہی

—— پتھر کوئلا کے جلے ہوئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے منیا نے راکھ کے اتنے ڈھیروں میں سے چن چن کر ایک چھوٹی سی ڈلیا میں تھوڑا سا رکھا تھا۔ وہ کوڑے، کرکٹ اور راکھ کے ایسے بہت سے ڈھیروں کو جانتی تھی کہ وہ کہاں کہاں اور کس کس جگہ پر ہیں۔ اسکے ننھے ننھے پاؤں دیکھنے میں تانت کی طرح سخت لگتے اور قمیص کی جھولتی ہوئی آستین سے باہر نکلے ہوئے ہاتھ بھی ویسے ہی تھے مٹیالے رنگ کے اور دبلے دبلے سے۔ اس کے چھوٹے سے معصوم چہرے پر اپنے کام کی سنجیدہ ذمہ داری چھائی رہتی۔ مگر کبھی کبھی جیسے ایکدم سے اکتا کر وہ کھلکھلا کر ہنستی ہوئی اپنی پیشانی پر لٹکتے ہوئے گرد سے اٹے ہوئے بالوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے نوچنے لگتی۔ کوئلا چنتے چنتے ایک ہی دفعہ اس کے سارے جسم میں چیونٹیاں سی کاٹنے لگتیں۔ ایک ہی طرح سے بار بار کھجلا کھجلاتے اسکا جی گھبرانے لگتا تھا۔ اور اس پر سے بتیا کی چیخیں جو روتی ہوئی اپنا ہاتھ اٹھا اٹھا کر اس کی گود میں جانے کو مچلنے لگتی تھی۔ جب سے منیا نے سفید چادر اُڑھا کر اپنی اماں کو پلنگ پر لے جائے جاتے ہوئے دیکھا تھا، اس روز سے یہ بتیا ہر دم اسی کی ننھی سی جان سے چمٹ کر رہ گئی تھی۔ اماں کا بیمار چہرہ پھر اس نے کبھی نہ دیکھا تھا، وہ اس روز روئی بھی تھی، مگر ایسے ہی بلے جاتے ہوئے۔ بس اس نے اتنا ہی دیکھا تھا کہ منوا بھیا اور کنوا بوبو رو رہے ہیں۔ "اماں رے اماں" اور اسے بھی رونا آ گیا۔ کنوا بوبو کو تو اسی روز اسکے سسرال والے

رکشا پر بٹھا کر لے گئے۔ مگر ان تین ننھے بچوں کو کسی نے نہ پوچھا تھا۔

شلجم کا پتہ چوستی چوستی بتیا منیا کے پاؤں کے قریب کھسکتی ہوئی پہونچ گئی تھی کہ "ارے میری بتیا رے" منیا اپنی پر شوق نگاہیں گڑیا پرسے بمجبوراً ہٹاتی ہوئی بڑے پیار سے بولی۔ اس کے بے رونق چہرے پر ایک مسرت ناچ رہی تھی، اس نے اپنے پھیلے ہوئے بازوؤں میں بتیا کو سمیٹ لیا۔ "میری بتیا گڑیا لے گی" منیا نے بہت محبت سے اپنی ایک ہاتھ ٹوٹی ہوئی گڑیا بتیا کی مٹھی میں پکڑا دی۔ اس کی گندی مگر معصوم آنکھوں میں اپنی بڑائی کا احساس جھلکنے لگا تھا۔ اب تک وہ خود ہی اس گڑیا سے کھیلنا چاہ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اس کے دل کے دبے ہوئے جذبوں میں سے بچپن کی ایک بھٹکتی ہوئی لہر باہر نکل پڑی تھی اور راکھ کے ڈھیروں کو کرید کرید کر کوئلا چننے سے بیزار ہو کے اس کا دل بھی کھیلنے کو تڑپنے لگا تھا۔ مگر بتیا کی چیخیں اور اس کے ننھے ننھے سے الجھتے ہوئے بازوؤں میں بتیا کا سارا جوش سرد پڑ گیا۔ اپنی چھوٹی سی آغوش میں کسی طرح لٹکتی جھٹکتی ہوئی بتیا کو لئے دفعتہً اس کے ننھے سے دل میں ایک ماں کی سی ذمہ داری اور اپنے بڑے ہونے کا احساس چھا گیا۔۔ بتیا شلجم کے پتے کو پھینک کر منیا کی گڑیا کو منہ میں لئے مزے میں چوستی لٹکتی اور کھسٹاتی چلی جا رہی تھی۔ اتنے ہی دنوں میں سڑک پر سوتے، اونگھتے، اور بھونکتے ہوئے طرح طرح کے کتوں کو منیا نے پہچان لیا تھا۔ وہ ان سے ذرا بھی نہ ڈرتی تھی۔ مگر ہاں جب

وہ آپس میں لڑتے لڑتے اس کے قریب آجاتے تو اسوقت وہ بھی چلانے لگتی تھی۔ فٹ پاتھ کے کنارے کنارے گہرے اور بہتے ہوئے نالے، کوڑوں کے ڈھیر کے ڈھیر، اور پھر یہ رنگ برنگے کتے، منو اور تنیا کی طرح اس کی زندگی سے کتنے قریب تھے۔ ننھی سی پانچ برس کی بنیا بیچاری زندگی اور اس کے فرق کو کیا سمجھ سکتی تھی۔ جب وہ سڑکوں پر خواہ مخواہ چلتے چلتے اور کھیلتے کھیلتے تھک جاتی تو اسے بے اختیار اپنا کونہ یاد آجاتا۔ اس کو اس اندھیرے کونے سے محبت تھی جو صرف انہی تینوں بھائی بہنوں کا اپنا تھا۔ وہاں کونے میں بچھے ہوئے تھوڑے سے پیال پر جب یہ تینوں ایک دوسرے کے پیٹ میں اپنا سر گھسا کر سونے لگتے تھے تو کتنی میٹھی نیند خود ہی لوریاں گاتی ہوئی انہیں تھپک تھپک کر سلانے لگتی تھی، کوٹھری کے چار کونے تھے، تین کونوں میں تو بڈھے گھسیارے کی اپنی چیزیں تھیں، چنگیریاں، رسی، کھرپی، ہنبا، ایک دو کالی کالی مٹی کی ہنڈیا۔ کچھ سوکھے ہوئے پتے، ایک چھوٹا سا چولہا، اور جلے ہوئے پتھر کوئلے کا ایک چھوٹا سا ڈھیر۔ چوں چوں کرتی ہوئی کاٹھ کی ایک چوکی بھی تھی اور میلی سی چادر بھی — اس اندھیری کوٹھری کے تین کونے اس کو کتنے گلزار لگتے تھے، رسے بسے ہوئے سے، اگر پھر بھی ایک اجڑا ہوا لونہ جو ویران پڑا تھا وہی تنیا کی نگاہوں میں سب سے زیادہ اپنا اور پیارا تھا۔ بتیا کو لئے ہوئے اور کبھی کبھی اکیلے میں بھی اپنی چادر سر سے پیر تک

لپیٹ کر وہ اپنی اماں کی نقل کرتی، لمبی سیدھی ہو کر، سر سے پیر تک لپٹنے میں اسے بڑا اچھا لگتا تھا۔ اسی طرح سے اس کی ماں کو سب لے گئے تھے نہ؟ اور آنکھوں کو بند کئے ہوئے اُسے لگتا جیسے وہ خود ہی اماں بن گئی ہے اس کی بغل سے چمٹی ہوئی بتیا کبھی اس کی چادر کو نوچ دیتی اور کبھی اُسے خود ہی ڈر لگنے لگتا تھا کہ کہیں سب لوگ اسے بھی سر پر رکھکر نہ لے جائیں، پھر جیسے بچاری اماں واپس نہ آئی ویسے ہی وہ بھی نہ آئے گی، اس بیچاری بتیا کو کون کھلائے گا۔ اور اس کی ماں بیچاری۔ وہ سوچتے سوچتے زور سے بولنے لگتی۔ "بتیا رے بھیّا اماں سے پیسہ مانگتا تھا رے! اِہی سے اماں بھاگ گئی۔" اور بتیا اپنے ننھے ننھے سے ہاتھوں سے منیا کے مُنہ پر تھپّڑ مارتے ہوئے ہی ہنسنے لگتی ـــ ہی۔ ہی۔ ہی۔ ہاہا۔ ہا۔ اسی کونے کی دیوار میں کبھی کبھی منوا کا چھوٹا سا "اُچکا" گھسا ہوا رہتا جس میں تھوڑے سے رنگین نچے ہوئے تاگے لپٹے ہوئے تھے، اور اسی تاگے کے سرے پر مہین کاغذ کی ایک رنگین تلنگی لٹکتی رہتی۔ کبھی کبھی سبز، نیلے، اور سرخ رنگ کی گولیاں بھی اس کی جیب میں آجاتیں۔ لونڈوں کے بیچ میں کھیلتے کھیلتے منوا کا وحشت زدہ کھلنڈرا چہرہ یک بیک اچاٹ ہو جاتا۔ گولی کھیلتے کھیلتے اس کے ہاتھ سست پڑ جاتے اور پیشانی پر جھولتے ہوئے ملگجے بالوں کو ایک جھٹکے سے پیچھے پھینک کر وہ خاموش ہو جاتا تھا۔ خود بخود جیسے کوئی زبردست طاقت

اس کے ہاتھوں کو روک لیتی تھی۔ اب بے دلی سے گوٹیاں اِدھر اُدھر لڑھکا کر وہ بیزار بیزار سا تھکا ہوا لگنے لگتا۔ اپنی سوکھی ہوئی گردن پر جمے ہوئے میل کو کھجلاتے کھجلاتے اس کو تیا اور نتیا یاد آنے لگتیں "اب ہم جاہیں رے جموا" بڑی حسرت سے آہستہ آہستہ اس کے پاؤں اٹھنے لگتے اور وہ دور تک مڑ مڑ کر دیکھتا جاتا۔ "ارے ای دیکھ سکھوا تر اداوے جا ہے" وہ آگے بڑھتا جاتا تھا مگر اس کا دل کھیل کی دلچسپیوں میں الجھتا ہوا پیچھے ہی رہ جانے کو مچلتا تھا۔ جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی لمبی سڑک کے دونوں طرف دار شکینیشن والوں کے قطار در قطار بارک بنے ہوئے تھے۔ خوش رنگ اینٹ اور سرخ کھپڑیل کے دو رویہ لمبے لمبے اونچے اونچے کمرے دور دور تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ جن کے آگے روشوں پر گھانس جما جما کر بہت سے تختوں میں ڈیلیا، نیک، نیزی، لابے، اور قسم قسم کے پھول ہر موسم کے جداگانہ رنگ و بو کے ساتھ کھلتے رہتے تھے۔ اونچی چہار دیواریاں بارک کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھیں، انہیں حلقوں میں اُن کی زندگی کے سارے سامان مہیا ہو جاتے تھے ان کے کھلے ہوئے گیٹوں پر نیپالی پہرے دار کھڑے رہتے کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ ہاں بس قسم قسم کے مرل، بھوکے، خارش زدہ کتے ہی کسی نہ کسی طرح نالیوں یا گیٹوں سے ہو کر اندر چلے جاتے تھے اور کوؤں کا ایک ہجوم بھی درختوں کی ٹہنیوں پر سے حملے کر دیا کرتا

تھا۔ چہار دیواری سے باہر صرف بھنے ہوئے گوشت اور بگھاری ہوئی دال کی خوشبوئیں آتی رہتیں۔ مزے دار لپٹتی سی خوشبوئیں جو خواہ مخواہ دماغ کے اندر لسبی چلی جاتی تھیں ــ دن بھر کے فاقے سے منوا کا جی شام تک نڈھال ہونے لگا۔ اس روز گلّی ڈنڈے میں بھی اس کا جی نہ لگا۔ رہ رہ کر اس کی سوکھی سوکھی ٹانگیں آپ ہی آپ تھرتھرانے لگتی تھیں۔ کٹی ہوئی تلنگی لوٹنے اور گولی کھیلنے میں بھی وہ اپنے کو نہ بہلا سکا۔ "باپ رے کیسے سب روزہ رکھتے ہیں!" اس کا نو برس کا ننھا سا دل روزے کے خیال سے لرز اُٹھا۔ ایسے ہی پاؤں سے گیند کی طرح وہ چلتے چلتے پتھر کے ایک ٹکڑے کو لڑھکاتا چلا جا رہا تھا، کہ یک بیک ایک تیز خوشبودار بھبھکا منوا کی ناک سے ہو کر حلق سے ہوتا ہوا اس کی روح میں اتر گیا۔ اس کی پھیکی پھیکی بدمزہ زبان خود بخود تر ہو گئی۔ اور اسی جگہ پہونچ کر جیسے اس کے پاؤں کی طاقت ایک دم سے ختم ہو گئی تھی، وہ لڑکھڑا کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اس کے قریب ہی دُم ہلاتے ہوئے طرح طرح کے کتّے کسی انتظار میں بیٹھے تھے۔ مگر اس کو کسی کا انتظار نہ تھا وہ تو اُن اڑتی ہوئی خوشبوؤں سے تازگی کا بس ایک سہارا لینا چاہتا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں، شاید وہ اونگھنے لگا تھا کہ آپس میں لڑتے ہوئے کتوں کی آواز سے چونک پڑا "ارے منوا۔ تیں بھی سے گا رسے"۔ اسی کے محلہ کا للوا اپنے ہاتھ میں جو پرات لئے کھڑا تھا۔ "ہاں

للو بھیا ہم کو بھی دے" منوا کی لرزتی ہوئی آواز کے ساتھ اس کی معصوم نگاہیں اور سوکھے ہوئے جسم کا ہر عضو بھی یہی پکارنے لگا تھا۔ بھوکے کتے کی طرح منوا کھانے پر ٹوٹ پڑا، کیلے کا چکنا پتہ اس کی انگلیوں کے درمیان کانپ رہا تھا اور جلدی جلدی کھاتے ہوئے اس کے منہ سے عجیب عجیب سی آواز نکل رہی تھی۔ شر۔ شر۔ شاپ سڑ سڑ" للوا اسے دیکھتے دیکھتے ہنس پڑا۔ "وارے بنگال کا بھکا، "بتیا اور بتیا لا بھی نا رکھے"۔ یک بیک جیسے چلتی ہوئی موٹر یا سائیکل میں بریک پڑ جائے، اسی طرح منوا کا ہاتھ رک گیا۔ کیلے کے پتے کو چاروں طرف سے موڑ کر وہ جانے ہی لگا تھا کہ للوا بولا "ای اتنا دن سے توں سب کہاں سے کھاتا تھا رے منوا"؟ "اماں جب مری تھی نے للوا بھیا۔ تو اوہی دن کوئی چول دان بھیج دیہیں تھا اوہی چلاتا تھا تھا تھوڑا دن۔ پھر گھر والا بڈھا دادا مار دیدیتا تھا۔ کل سے اُو بھی بیمار ہے"۔۔۔ للوا کے چہرے پر ہمدردی اور رحم کی ایک سرخی دوڑ گئی۔ "تو سن کل سے آجاگا دس بجے دن کو اور پھر یہی ٹیم۔ ہم اندر رہیں گے۔ یہی نالی ہیں تو ہاتھ دے گا ہم ادھر سے تورے دیدیہاں گے سمجھے نا"۔ سامنے باورچی خانہ سے بہتی ہوئی نالی چہار دیواری سے باہر پیچ و تاب کھاتی ہوئی دور تک چلی گئی تھی۔ بہتے ہوئے پانی کے ساتھ سفید سفید بھات سرخ ٹماٹر کے چھلکے اور روٹیوں کے چورے ٹھہر ٹھہر کر، رک رک کر، آگے بہتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ منوا

کی نگاہیں نالی پر جم کر رہ گئی تھیں اور اُس کے خیالات باورچی خانے کے بھرپور خزانہ کے گرد منڈلا رہے تھے جس کا فیض اس طرح سے رواں اور دواں تھا۔ وہ خوشی سے جھوم گیا، اس کو خود ہی اتنے زور کی بھوک لگتی تھی کوڑے پر سے سڑا ہوا کیلا اور نارنگی بھی اُٹھا کر کھا لیتا تھا، اور اسی سے وہ سمجھتا کہ منیا اور بٹیا کو کتنے زور کی بھوک لگتی ہوگی۔ مگر جب کبھی منیا بھوک سے بیکل ہو کر روئے چلی جاتی تو منوا کو بڑا غصہ آجاتا تھا اور وہ اس کی ریڑھ کی ابھری ہوئی ہڈیوں پہ دو چار دھموکے لگا کر اپنی ماں کے الفاظ بڑبڑانے لگتا۔ "اتنہہ ہی ایں پیدا ہووے کو تھا اور کہیں 'نا'۔" منیا کو روتے ہوئے دیکھکر بٹیا بھی بلک کر رونے لگتی تھی اور ان دونوں کو روتا ہوا دیکھ کے منوا کا بھی جی چاہتا کہ وہ بھی اُن کے ساتھ ہی ساتھ خوب زور زور سے چیخ چیخ کر رونے لگے۔

"اس پتے میں بھات دیکھکر منیا کتنا خوش ہوگی؟ منیا کی مسرتوں کے احساس ہی سے منوا مسکرانے لگا۔ اب وہ منیا کو کبھی نہ مارے گا۔ کیسی پیاری سی ہے بچاری۔ اس کا دل بے اختیار چاہ رہا تھا کہ تیزی سے دوڑ کر منیا سے لپٹ کے کہے کہ۔ منیا — اب ہم کو روز دال بھات اور گوشت بھی ملے گا — ہاں روز۔ روز۔"

اچانک اس کو اپنی اماں یاد آئی — ہائے بچاری اماں! تم تو بس خالی مار ہی پیٹتے پیٹتے مر گئیں۔ جس کے گھر میں اس کی اماں کھانا

پکاتی تھی اسی کے بچوں کی طرح اُس نے بھی ابا اور اماں کہنا اپنے بچوں کو سکھایا تھا۔ اماں اب اگر تم زندہ رہتیں تو ہم تمکو اسی کیلے کے پتے ہیں سے جا کر روز مزے مزے کا کھانا کھلاتے۔" اس کی نگاہوں کے سامنے اپنی اماں کا سانولا اور کمزور چہرہ گھوم گیا۔ کیسی اچھی پتلی سی آواز تھی اس کی۔ جب وہ اس کو پکارتی تھی۔ "منوا" تو اس کے کانوں میں جیسے سیٹی سی بجنے لگتی تھی دیکھنے ہیں۔" پہلے اس کو کتنی تکلیف رہتی تھی۔ جب کبھی ہم بھوکے رہتے تھے تو اماں اس روز ہم لوگ کو اپنے پیٹ سے اور زیادہ سٹا کر سلاتی تھی۔ اور اس دن تو رات بھر جیسے اسے نیند ہی نہ آتی ۔۔" سوچتے سوچتے منوا کا دل بجھ گیا، آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بھی وہ بہت جلد اپنی کوٹھری کے پاس پہنچ گیا تھا بتیا نالے کا کیچڑ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتھڑے سامنے گلی میں کھیل رہی تھی، ادھر منیا گلی کی دو چار بچیوں کے ساتھ اینٹ کے چولھے پر ٹھیکرے میں مٹی دھرے جھوٹ موٹ کا کھانا پکا رہی تھی ۔۔۔ منوا کو دیکھتے ہی اس کے ننھے سے معصوم چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی "کھانا پکے ہے بھیا ۔۔۔ وادا ایساکے" اس کا دادا وہ بڈھیا گھسیارہ تھا جس کی کوٹھری کے ایک گوشے میں سب رہتے تھے۔ تمباکو کی دکان پہ بیٹھے ہوئے خیرو میاں زور سے بولے "بڑا الاخیرا ہے رے لونڈا ۔۔ دن بھر ۔۔ اتنی چھوٹی چھوٹی بہن سب کو بھوکا چھوڑ کر بس تجھے اپنے کھیل تماشے ہی سے کام

ہے چھی — چھی — چھی۔ اگر ہم آج ان دونوں کو کھانا نہ کھلا دیتے تو مر ہی جاتیں بچاری سب۔ اللہ توبہ۔ توبہ کیسی مہنگاری ہے، تب بھی بس ایمان کی سلامتی چاہیے۔" منوا خیرو میاں کی باتیں سنتا رہا۔ اس کا جی اندر سے گھبرا رہا تھا۔ ایک مہینے کے بعد آج اس کو اپنی ماں یاد آرہی تھی۔ منیا اور بتیا کو لئے ہوئے وہ کوٹھری میں آکر اپنے پیال پہ بیٹھ گیا۔ منیا اور بتیا نے جب کیلے کے پتے کو چاٹ چاٹ کر اپنے تھوک سے ایکدم سے چکنا کر دیا تو منوا نے بڑی ہمدردی اور محبت سے اُن کے ہاتھ کو دھوکر اپنے پاس لٹا لیا۔ ایسے ہی وہ خود اپنی ماں کی بغل میں سٹ کر سوجاتا تھا نہ؟ آج اس کے دماغ میں جیسے خیالات کے سوتے پھوٹ گئے تھے جو رس رس کر اس کی آنکھوں سے بہتے ہی چلے آرہے تھے۔ اس طرح کی کتنی کوٹھریاں اس کو یاد تھیں، وہ گننے لگا ایک وہ کھنڈر والی کوٹھری جہاں بیر کا درخت تھا۔ دوسری جس کے ساتھ ایک استارہ بھی تھا اور ایک وہ جہاں اماں گر پڑی تھی۔ بھینگا بھینگا سا برآمدہ، اور ایک وہ بھی تو جہاں سے ابا اماں سے لڑ کر بھاگا تھا۔" کمینہ ابا کتنا خراب سا تھا وہ۔ دن رات اُسے بس اپنے تاڑی اور دارو ہی سے کام تھا۔ اور اس کے بعد پھر نشہ میں اماں سے لڑتا اور ہم سب کو مار پیٹ کر اماں کے ہاتھ پاؤں توڑ دیتا۔ سینما کی کبھی کی دیکھی ہوئی تصویر کی طرح اس کو اپنے باپ کے چہرے کی تھوڑی سی جھلک یاد آجاتی،

تانبا سا لال چہرہ اور چندلا سر" کنو بوبو کبھی کبھی کہتی تھی کہ ابا پہلے کوڑے والے موٹر کو چلاتے تھے تب اماں بہت بہت سا کلیجی پکاتی تھی اور چائے میں بغیر بھپلائے وہ سوکھے بسکٹ کبھی نہ کھاتی تھی۔ مگر جب تاڑی پیتے پیتے ابا کی نوکری چھوٹ گئی تو ایک دن اماں سے لڑ جھگڑ کر ابا کہیں چلا گیا۔ اچھا ہوا جو پھر نہ آیا — بچاری تنبیا اماں کے پیٹ ہی میں تھی کہ ابا چلا گیا تھا —!

اتنی منہگاری میں بھی بچاری اماں کو کھانا پکانے میں زیادہ مشاہرہ نہ ملتا تھا۔ اتنا منہگا چاول صرف تین ہی روپے کی تنخواہ میں بھر مہینہ کیسا پورا پڑتا۔ اور اس پر سے اتنے کھانے والے۔ تب سے بچاری اماں مجبور ہو کر مزدوری کرنے لگی تھی۔ اوپر تلے تھاک کے تھاک اینٹ رکھکر جب وہ چلنے لگتی تو اس کی سوکھی ہوئی گردن کے ساتھ اس کا سارا جسم بھی ڈولنے لگتا تھا۔ مگر اس زمانہ میں اس کی اماں ہر روز بڑا اچھا کھانا پکاتی تھی۔ اور اس کے پاس پیسے بھی رہنے لگے تھے مگر اسی کے چھ مہینے بعد سے اس کو ایسا جاڑا بخار لگا کہ اس سے آخر دم تک پیچھا نہ چھٹا۔ کیسی کیسی مشکلوں سے اس کی اماں کے پاس اتنا پیسہ بچ گیا تھا کہ جو دو مہینہ اس کی بیماری میں خرچ چلا تھا۔ اور اس کی اماں بچاری کا آخری خرچ تو محلے بھر کے چندے میں سے ہوا۔ وہ چندے بھی آخری ہی تھے۔ پھر کسی نے اُن تین معصوم بچوں کو نہ پوچھا تھا" مگر اب منوا کے دل

کو ایک سکون لگ رہا تھا کہ اب وہ کبھی بھوکا نہ رہے گا۔ بچارہ بڈھا دادا اماں کے وقت سے مہربان تھا۔ اماں سے ہر مہینہ کوٹھری کے کونے کا ایک روپیہ کرایہ لے کر ابھی تک ان کا خیال کر رہا تھا۔ منوا کرایہ کہاں سے لاتا، دادا نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ ہر روز ایک چھوٹی سی ڈلیا میں کوئلا چن کر لا دیا کرے اور مفت میں پہلے کی طرح رہے۔ اس کوٹھری، اور اسکے پرانے کونے کے ساتھ ساتھ سرخ رنگ کی چہار دیواری کی بہتی ہوئی نالی کے سوراخ سے بھی اب محبت لگتی تھی جس کے اس پار سے للوا اس کو کیلے کے پتے میں کبھی روٹی اور کبھی دال بھات پکڑا دیتا تھا۔ منوا کے ساتھ منیا اور تنیا بھی اسی جگہ منڈلاتی پھرتیں۔ اور سارا سارا دن اسی چہار دیواری کے گرد وہ تینوں کھیلتے کھیلتے گزار دیتے تھے۔ منیا تنیا کے ہاتھوں کو پکڑے اس کو پاؤں پاؤں چلنا سکھاتی، اور نزدیک ہی منوا گلی ڈنڈا اور کبھی گوبیاں کھیلتا رہتا تھا۔ لمبی دوڑتی ہوئی سڑک بارک کی چہار دیواریوں کے ٹھیک سامنے دو لمبے لمبے کرچی پایوں کے درمیاں سے گھستی چلی گئی تھی۔ منوا کے پاؤں چلتے چلتے اسی حد پر آکر رک جاتے تھے جس کے دونوں طرف کوارٹر کی چمکیلی عمارتیں رات کو بجلی کی روشنی میں جگمگانے لگتی تھیں۔ اکثر ان کے بڑے بڑے احاطوں سے چھچاتی ہوئی کاریں نکلتیں جن کے ہورن دور دور تک گونج اٹھتے تھے۔ اسی بڑے احاطہ کے اندر موہن بابو نے جب سے امرود چرانے

دیکھکر لکھنا کو پیٹا تھا منوا سرکاری پروفیسروں کی کوٹھیوں سے بہت دور رہنے لگا تھا۔ اور اس کو کمرخی پایوں کے اندر سے کچھ کام بھی نہ تھا۔ اس کے کھیلنے کے لئے اتنی لمبی سڑک بہت کافی تھی۔ نالی کے اندر سے ملتا ہوا کھانا اور میونسپلٹی کے ہر وقت کھلے ہوے نل کا پانی ان کے پیٹوں کو بھر دیتا۔ وہ دن بھر کوڑوں کے ڈھیر پر چمٹے ہوئے کوئلے چنتے رہتے اور پھر کونے کے پیال پر پڑ کر بے خبر سو جاتے۔ اس سے زیادہ کی انہیں تمنا بھی نہ تھی۔ بھنبھناتے ہوئے دل کے دل مچھروں کی بھی ان کو پرواہ نہ رہتی اور وہ تینوں تھکے ہارے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ کر بڑے پیار سے سوئے رہتے۔

اسی طرح تھوڑے دن گذر گئے۔ مگر یک بیک جب آٹھ روز کی چھٹی لے کر للوا اپنی سسرال چلا گیا تو اس دن سے تینوں بچے پھر بڈھے دادا کے چھوٹے سے چولھے کے گرد بیٹھے پانی کی طرح پیتے ہوئے ماڑ کو حریص نظروں سے تکنے لگے۔ مگر ہر روز اس کے چولھے کا جلنا کوئی ضروری نہ تھا۔ پھر وہ کتوں کی سونگھتی ہوئی ناکوں کی طرح دوکانوں کے نیچے۔ سڑکوں کے اوپر اور کوڑوں کے غلیظ ڈھیر پر اپنی متجسس نظروں سے کچھ ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ خیرو میاں کی بکری اپنے یہاں کا ماڑ پی پی کر بہت سا دودھ دیتی تھی۔ اور منوا تو اسے پی کر بس پچاتا ہی جانتا تھا۔ تبیا

بھوکی رہ رہ کر چڑچڑی ہو گئی تھی۔ ہر گھڑی اس کے منہ سے بس وہی ٹیں ٹیں کی ایک آواز نکلتی رہتی۔ بڈھا گھسیارہ اور خیرو میاں کے ساتھ ساتھ کئی اور لوگوں کا جی اس مسلسل آواز سے گھبرا گیا تھا۔ آخر گھسیارہ اس کی کنوآ بو بو کے میاں کو بلا لایا۔ "میاں ہم بھر پایا۔ رات کو دو گھڑی کا چینو نہ لیوے دے ہے ای چھوکری" منیا کی گردن سے چمٹی ہوئی بتیا مڑ مڑ کر تکتی ہوئی اپنی شکایت سن رہی تھی۔ کنوا کے میاں کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ اس کا باپ ایک قصائی تھا۔ بیکار بیٹھے ہوئے بیٹے اور بہو کا خرچ چلاتے چلاتے تو اس کا دم نکلا جاتا تھا اور اب یہ تین تین بچڑوں کا سوال تھا۔ بڈھا گھسیارہ کھانستا ہوا بولا "ارے ہم کو تو موہ لگے ہے ای سب پہ جو گلا سے لگائے ہوئے ہیں، مگر بتیا لا دل دکھے ہے۔ ایسا کپکپی کا جاڑا اور بس ایک ٹھو چدّر۔ اس سے تو اچھا ہے کہ پادری کے اسپتال میں بتیا کو دے آؤ۔ مجے میں بس کھاگی اور کھیلے گی!" کنوا کا میاں چونک اٹھا، کتنی صاف اور سیدھی سی بات تھی۔ اپنی جیب میں سے ایک اکنی نکال کر کنوا کے میاں نے منیا کو دی۔ "جا منیا منوا کو ساتھ لے لے ٹھو کی مٹھائی لے آ" اور اس نے جھنجھتی ہوئی بتیا کو اس کی گود سے لے لیا۔ منیا اور منوا جب چلے گئے تو بڈھے گھسیارے کو ساتھ لیکر وہ نچلی سڑک سے سیدھا پادری کے اسپتال چلا گیا وہاں بہت سے قاعدے اور قانون کی کتابوں پر اس کے

انگوٹھے کا نشان لیا جا چکا تو ایک سفید سی ساڑی پہنے ہوئے کالی سی نرس کی گود میں چیختی ہوئی بتیا کو زبردستی دے کر وہ جلدی سے اسپتال کے بڑے پھاٹک سے نکل آیا۔ اب اس کا دل بہت ہلکا ہلکا سا لگ رہا تھا۔۔۔۔ راستے میں بڈھے گھسیارہ کو اس نے سمجھا دیا تھا کہ اس کے گھر کے بغل میں جو شبراتی باورچی رہتا ہے اس سے کہہ سنکر کہیں منوا اور منیا کو رکھا دے منوا تو کام کرنے کے لائق تھا اور منیا بھی چھ مہینہ سال بھر تک کام کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ اب اس کو اطمینان ہو گیا تھا اور وہ اسی طرف سے اپنے گھر واپس چلا گیا۔ منیا بتیا کے لئے دو دن تک گھبرا گھبرا کر روتی رہی۔ منوا کا جی بھی اچاٹ سا لگتا تھا۔ "ہائے بچاری کیسی کھلونا ایسی تھی"۔ ادھر ادھر گھوم پھر کر بھی اس کا جی نہیں لگتا تھا اور نہ کسی طرح سے اس کا پیٹ ہی بھرتا تھا۔ اس پر سے منیا بتیا ہی کا ماتم کئے جاتی تھی۔ منیا کو لٹھو کی مٹھائی سے ایک نفرت سی ہو گئی تھی۔ للوا کے جانے کے بعد اب وہ شبراتی باورچی سے ہل مل گئے تھے جو کبھی کبھی روٹی کے اوپر آلو کی بھجیا رکھکر انہیں کھانے کو دے جاتا تھا۔ کمرخی پائے کے اندر سے امرود توڑنے کی مار کے خوف کے ساتھ اب بھجیا اور روٹی کا مزہ ملنے لگا تھا۔ اسی لئے جب شبراتی منیا اور منوا کو اپنی کوٹھی پر لے جانے لگا تو تھوڑی سی جھجک کے بعد وہ اس کے ساتھ

جانے لگے۔ ان کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا جب وہ اتنی آرائش اور نفاستوں کو اپنے اتنے قریب سے دیکھ رہے تھے۔ شبراتی کی باتوں سے بیگم متاثر ہو رہی تھیں۔ "ہاں شبراتی ایسی غضب کی گرانی میں جو نہ ہو جائے۔ کتنے بچارے بھوک سے اسی بنگال میں مر گئے۔"

"اور بیگم صاحب خیرو میاں اور سارے محلہ بھر کو اسی کا تو رونا ہے کہ وہ ہندو گھسیارہ ایک مسلمان بچی کو کرستان بنا دے کو اسپتال میں دے آیا۔" اندر دروازے کے پٹ سے لگا ہوا منوا ایک مجرم کی طرح دبکا کھڑا تھا اور اس کی قمیص کا دامن پکڑے ہوئے منیا سہمی ہوئی بس اپنی انگلیوں کو ملتی چلی جا رہی تھی۔ اس روز نہا دھو کر صاف صاف کپڑے پہن کر وہ دونوں دن بھر اِدھر اُدھر اچکتے رہے۔ رات کو بجلی کی روشنی میں جب ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی نکہت کچھ پڑھ رہی تھی تو اس کے قریب ہی دوسرے صوفہ پر مسکراتی ہوئی منیا اچک کر بیٹھ گئی "ہمرے بھی چوڑی نہ پہنا دے گی۔" نکہت پڑھتے پڑھتے چونک اٹھی۔ منیا اس کے ہاتھ میں سونے کے برسلٹ کو چھو رہی تھی۔ نکہت کا دل رحم کے جذبات سے بھر گیا "ہاں پہنا دوں گی منیا۔" "او۔ ای ہمرا کرتا بھی لال رنگا دیگی۔ اچھا آؤ ہم جوتا بھی پہنے گے۔" منیا مسکرا مسکرا کر اپنی تمناؤں کا اظہار کیے جا رہی تھی۔ "ہاں سب منگا دوں گی سب۔ مگر۔ مگر۔ مگر دیکھ اس کے اوپر مت بیٹھ۔ ارے اس قالین پر بھی نہیں۔ وہاں

برآمدے میں جا کر کھیل ۔" ایکدم لہلہاتے ہوئے پودے میں جیسے کسی نے کھولتا کھولتا پانی ڈال دیا ہو۔ مُنیا کا کھلا ہوا چہرہ مُرجھا گیا۔ اور وہ آہستہ آہستہ کمرے سے نکل گئی۔ پہلی بار کمبل اوڑھ کر سونے میں منوا کو بہت اچھا لگا۔ دوسرے دن جب وہ کچھ دیر کے بعد سو کر اُٹھا تو شبراتی کا بگڑنا اس کو ایک نئی بات لگی۔ اتنے سویرے اُٹھنے پر بھی وہ دیر ہی کہے جا رہا تھا۔ اس سے پہلے اگر وہ بارہ بجے دن تک بھی سویا رہتا تو کوئی بھی ٹوکنے والا نہ تھا۔ ناشتہ کرنے کے درمیان میں دو دفعہ اسکو سڑک پر سے گولی کھیلتے کھیلتے پکڑ لایا گیا۔ اسکے چہرے پر ایک عجیب سی وحشت برس رہی تھی اور وہ گھٹا گھٹا سا لگ رہا تھا۔" ارے مُنیا یہ اینٹ اور ٹھیکرے سے گندا کر کے کھیلے گی تو صاحب بگڑیں گے۔ اور دیکھ یہ پھول مت توڑنا سمجھی نہ۔" اور اس وقت خواہ مخواہ مُنیا کا جی پھول توڑنے کو مچلنے لگتا اور ٹھیکروں سے چولھا بنا کر کھیلنے کو اس کی روح ترسنے لگتی۔" دیوار سے لگ کر مت کھڑا ہو منوا۔" اور منوا اس طرح سے چونک کر دیوار کو دیکھنے لگتا جیسے اس دیوار پر کوئی بچھو رینگ رہا ہو۔ مگر اس کے سامنے صرف اُجلی اُجلی چونہ کی ہوئی دیوار چمکتی رہتی۔" ارے پانی پی کر یہاں پر کُلّی نہ پھینکا کر منوا! ایکدم سے جنگلی ہے تو بھی۔" جھوا شان جما کر کہتا۔ مُنیا کاغذ کے کترے ہوئے ٹکڑوں کو مٹھی میں دبائے جب نالے کے اس پار زمین میں پھینکنے کے لئے گئی تو اس کا جی گھبرانے لگا۔ آخر اس کاغذ کو اس نے پھاڑا ہی کیوں تھا جسکی وجہ سے اسے اتنی دور آنا پڑا۔ دوسرے

ہی دن منوا کا جی اس قید خانے سے اُکتا گیا۔ روٹی بھنجیا کیساتھ دونوں وقت میٹھی میٹھی چائے اور بھانت کے ساتھ بھنے ہوئے گوشت اور مچھلی سے بھی اس کا جی بھر گیا تھا۔ جب وہ تلنگی ہی نہیں اڑا سکتا تھا تو پھر بیگم صاحب کے پیسے کی اُسے ضرورت ہی کیا تھی۔" بیکار بیٹھی بیٹھی منیا کا جی نہیں لگتا تھا بیگم صاحب گردن کی طرف شبراتی اسے جانے نہ دیتا تھا۔ کل دن بھر کی مسکراہٹ اس کے چہرے سے مٹ چکی تھی اور اس کی جگہ تحیر اور خوف چھا گیا تھا۔ جھوا آپنے بڑے بڑے دانت نکالے ہوئے ہنس پڑتا۔ "ہائے رے جنگلی۔" ایکدم سے بندر ہے بندر۔" اس وقت منوا کا چہرہ شرم اور غصہ کے ملے جلے ہوئے جذبات سے تمتما جاتا جب تیسری دفعہ شبراتی منوا کو کھیل میں سے پکڑ لایا تو اس کی جیب سے اُس نے ساری گولیاں نکال لیں۔ منوا بے بس طور پر باہر دیوار سے لگ کر آہستہ آہستہ سسکنے لگا۔ مُنیا نے اس کے رونے کی آواز سُن لی وہ چپکے سے باہر گئی اور روتے ہوئے منوا سے لگ کر بڑی محبت سے بولی۔

چل رے بھیا۔ گھر رے چل! ۔ ہم اپنی بتیا کو بھی لے آدیں گے۔"

وہ اپنی کلائی میں جھنجناتی ہوئی چوڑیوں اور لال لال کرتے کو بھول گئی تھی۔ ماں کی محبت بھری آغوش کی طرح اس کو کوٹھری کا کونہ یاد آرہا تھا۔ منوا باہر شاگرد پیشے سے اپنی چادر چپکے سے نکال کر لے آیا اور مُنیا کا ہاتھ پکڑے جب وہ تیزی سے دوڑتا ہوا کمرخی پائیوں کی حد سے

باہر نکل آیا تب کہیں اس کی جان میں جان آئی۔ ایک اطمینان اور سکون کا سانس لیکر وہ بیچ سڑک پر اپنے دوستوں کے جھُرمٹ میں بیٹھ کر مزے سے گولیاں کھیلنے لگا۔ اور مُنیا گرد اور مٹّی میں لت پت چہار دیواری سے لگی بیٹھی، اپنی گود میں اینٹ کا بابو لئے جھوم جھوم کے گاتی ہوئی اُسے سُلا رہی تھی۔

"آجا میری بتیا کی ننیا رے۔"

ہماری دُوسری کتابیں

”ڈھونگ“ شوکت تھانوی کا رومانی ناول، نئے مزاحیہ ڈھنگ میں اُداسی اور مردہ دلی کا شرطیہ علاج۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ

”نئے اِنسان“ قدّوس صہبائی کا انوکھا ناول۔ ہندوستان کے انقلابی ماحول میں حُسن و عشق کی کارفرمائیاں۔ سماجی انقلاب میں عورت کی مرد سے ہمسری کی کشمکش اور محبت کا آخری فیصلہ۔ نئے انسانوں کے عشق و محبت کی نئی داستان۔ قیمت چار روپیہ۔

”ایک گرجا ایک خندق“ نقاشِ فطرت کرشن چندر کے نئے غیر مطبوعہ دلچسپ افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ۔

”کانچی ہاؤس“۔ ماہر القادری کا پاکیزہ نفسیاتی، اخلاقی اور سبق آموز ناول۔ شاعرانہ طرزِ بیاں اور سلیس اُردو زبان میں معاشرتِ انسانی کا مطالعہ۔ قیمت تین روپیہ چار آنہ۔

”نسرین“ رشید اختر ندوی کا نیا ناول عنقریب تیار ہوگا۔

”زندگی کا میلہ“۔ ”سنگِ میل“۔ ”ادب اور انقلاب“۔ اختر حسین رائے پوری کی تصانیف زیر طبع

”تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد“۔ مرتبہ قاضی عبد الغفار۔ زیر طبع۔

نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلیکیشنز لمیٹڈ
نیشنل ہاؤس۔ اپالو بندر، بمبئی ۱

دوسری کتابیں جو ہمارے یہاں ملتی ہیں

مجھے خرید لو	شوکت تھانوی	ایک روپیہ بارہ آنہ
ہچکولے	رئیس احمد جعفری	تین روپیہ چار آنہ
شیطان	قیسی رام پوری	تین روپیہ
ثمر	خواجہ محمد شفیع	ایک روپیہ آٹھ آنہ
سہاگن	ایم اسلم	دو روپیہ
ایک کاروباری مجلد	اختر اورینوی	بارہ آنہ
بدلیاں	سحاب قزلباش	دو روپیہ آٹھ آنہ
ارمان	آغا شاعر	دو روپیہ
چل ترنگ	دلشیں	دو روپیہ چار آنہ
شب تاب (نظمیں)	اسرار الحق مجاز	دو روپیہ چار آنہ
معاہدہ ہند و برطانیہ	سر سلطان احمد	ایک روپیہ آٹھ آنہ
اعمال نامہ	سید رضا علی	آٹھ روپیہ

شعبۂ اردو
نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلیکیشنز لمیٹڈ
نیشنل ہاؤس
اپالو بندر بمبئی ۱